۸۵

امام جعفر صادق علیہ السلام

اور

سائنسی انکشافات

۲۵ عالمی دانشوروں کی تحقیقات کا مجموعہ

ناشر

مؤسسۂ اہلبیتؑ پاکستان

نام کتاب ــــــــــــــــ امام جعفر صادقؑ اور سائنسی انکشافات
اثر ــــــــــــــــ ۲۵ بین الاقوامی دانشور
ترجمہ ــــــــــــــــ مولانا سید محمد باقر جوراسی
تصحیح و ترتیب ــــــــــــــــ سید محمد علی اجہدی
ناشر ــــــــــــــــ موسسہ اہلِ بیتؑ
تعاون ــــــــــــــــ سازمانِ تبلیغاتِ اسلامی ایران
تاریخِ اشاعت ــــــــــــــــ ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ - اپریل ۱۹۹۴ء
تعداد ــــــــــــــــ 2000

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

فہرست

پیش لفظ ۵
عناصرِ اربعہ کے عقیدے سے پہلا اختلاف ۷
کیا جدید علمی دور کے موجد امام جعفر صادقؑ ہیں؟ ۱۹
زمین کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کا نظریہ ۲۶
امام جعفر صادقؑ کی نظر میں خلقت کا مسئلہ ۳۲
امام جعفر صادقؑ اسلام میں عرفان کے بانی ۴۰
امام جعفر صادقؑ نے شیعی ثقافت کی تشکیل کی ۵۴
شیعی ثقافت میں بحث و مباحثہ کی آزادی ۶۱
ادب امام جعفر صادقؑ کی نظر میں ۷۱
علم امام جعفر صادقؑ کی نظر میں ۸۴
تاریخ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں ۹۸
انسانی جسم کی ساخت کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کا نظریہ ۱۰۶
ابراہیم ابنِ طہمان اور ایک قانونی مسئلہ ۱۱۴
امام جعفر صادقؑ کے معجزات اور شیعوں کا عقیدہ ۱۱۹
روشنی کا نظریہ اور امام جعفر صادقؑ ۱۴۰
زمانہ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں ۱۷۱
امام جعفر صادقؑ کے نزدیک بعض بیماریوں کے اسباب ۱۸۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

یہ کتاب جو "امام جعفر صادقؑ مغزِ متفکرِ جہانِ شیعہ" کے نام سے مختلف زبانوں میں طبع ہو کر کافی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ اصل میں یورپ کی ترقی یافتہ دنیا کے سائنسدانوں اور دانشوروں کی اپنے معیارات اور نقطہ نظر کے مطابق علمی کاوشوں اور موشگافیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ نتائج جن پر ان یورپی دانشوروں نے رسائی حاصل کی ہے دراصل وارثِ پیغمبرِ اکرمؐ، مذہبِ اہلِ بیتؑ کے موسس و بانی، الٰہی سلسلہ خلافت و امامت کے چھٹے تاجدار اور اسلامی شاہراہِ ہدایت کے روشن منارے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منسوب ہیں۔

بہر حال ایک تو اس سے قبل ان مسائل پر اسلامی طریقہ استدلال سے تحقیق و تدقیق نہیں ہوئی ہے اور دوسرے جن افراد اور دانشوروں نے ان علمی انکشافات کو جمع کیا ہے وہ طبیعی علوم کے علاوہ ماوراء طبیعی علوم پر کوئی توجہ نہیں رکھتے، نہ انہیں ان علوم سے کوئی آگاہی یا آشنائی ہی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر انسان فطرتاً شعوری یا لاشعوری طور سے اس جانی بوجھی یا انجانی راہ پر گامزن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان دانشوروں نے انبیاء کرامؑ اور ائمہ اطہارؑ کے علوم و معارف کو اکتسابی بشری استعداد اور انسانی قوتِ فکر کے آئینہ میں دیکھا اور جب انسانی اندازے اور بشری طاقتِ فکر تھک کر جواب دے گی تو یہ لوگ توجیہ و تاویل یا مدرک و سند کی تلاش میں گئے کہ یہ کس کے اقوال اور کس کی کہی ہوئی باتیں ہیں؟ لیکن جو لوگ دنیا و ما فیہا کو

الٰہی اسرار اور تخلیقِ کردگار کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور انبیاء وائمہ علیہم السلام نیز علمائے کرام کے علوم کو طبیعت اور ماوراء طبیعت کے حقائق تک پہنچنے کا وسیلہ وذریعہ قرار دیتے ہیں وہ تمام علوم کی پیشرفت، نئے نئے انکشافات غرض کہ ہر طرح کی ظاہری علمی ترقی سے پہلے الٰہی علوم کے وارث انبیاء وائمہ علیہم السلام کے اقوال و ارشادات کو ہدایت کا سرچشمہ اور خالقِ علم و نور سے مربوط جانتے ہیں اس طرح وہ لامتناہی معیاروں اور اندازوں کو بشری اندازوں سے نہیں ناپتے۔

اس کے باجود امتِ اسلامی کو ان یورپی دانشوروں کا شکرگزار ہونا چاہئے جو دراصل ہر تحقیق و انکشاف کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں اور جنہوں نے آج کی دنیا میں انسانی حقوق، آزادیٔ بشر اور آزادیٔ قلم کو اپنے منافع و مفادات سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے علوم ومعارفِ اہلِ بیت علیہم السلام سے کسی حد تک آگاہی حاصل کرنے اور الٰہی علوم کے حقیقی وارثوں کی صحیح معرفت حاصل کرنے کے لئے ترقی یافتہ دنیا کے روبرو ایک روشن و منور راہ کھول دی ہے۔ امتِ اسلامی کے لئے بھی یہ بات لائقِ غور و فکر ہے کہ اجنبی اقوام ان کی علمی میراث کو یوں اجاگر کر رہی ہیں جبکہ ان کے پاس صحیح اور غیر صحیح کو ناپنے والے درست اندازے بھی نہیں اور ہم ابھی "قال - اقول" کی بھول بھلیوں ہی میں گم ہیں۔

غرض کتابِ ہذا جو ہمارے محترم قارئین کے ہاتھوں میں ہے اور ہم انہیں اس کے مطالعہ کی دعوت دے رہے ہیں یہ یورپ اور امریکہ کے چند دانشوروں کی اپنے لحاظ سے علمی کاوشوں اور محنتوں کا ثمرہ و نتیجہ ہے اس اعتبار سے اسے اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل ہم آہنگ اور آخری نظریہ و نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جو امت بابِ اجتہاد کے وا ہونے کی قائل ہے اور اپنے اوپر تحقیق کے دروازے بند نہیں کرتی وہ اس کاوش کو بھی صحت مند دماغوں اور صاحبِ فکر پڑھنے والوں کے حوالے کرتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہے۔

ناشر

عناصرِ اربعہ کے عقیدے سے پہلا اختلاف

امام محمد باقر علیہ السلام کی درس گاہ میں جن علوم کا درس دیا جاتا تھا ان میں علمِ طبیعیات بھی شامل تھا۔ اگرچہ امام جعفرصادق علیہ السلام کے علمِ طب کی بنیادوں پر ہماری زیادہ نظر نہیں ہے۔ لیکن علمِ طبیعیات کے بارے میں ان کی مہارت سے ہم زیادہ واقف ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے یہاں ارسطو کا علمِ طبیعیات پڑھایا جاتا تھا اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ارسطو کی طبیعیات میں کئی علوم شامل تھے۔ آج علمِ حیوانات' علمِ نباتات اور علمِ جمادات کو طبیعیات کا جزو نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان میں سے ہر ایک جداگانہ علم ہے لیکن ارسطو کی طبیعیات میں ان علوم کے بارے میں بھی بحث کی گئی ہے جس طرح "میکانیات" (MECHANICS) ارسطو کی طبیعیات میں داخل ہوگیا۔

اگر ہم طبیعیات کا مفہوم علم الاشیاء قرار دیں تو ارسطو کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ مندرجہ بالا مباحث کو علمِ طبیعیات میں شامل کرلے کیونکہ یہ ساری بحثیں علم الاشیاء پر مشتمل ہیں۔

(بقول مستشرقین) احتمال یہ ہے کہ ارسطو کی طبیعیات بھی اسی ذریعہ سے امام محمد باقر علیہ السلام کی درس گاہ تک پہنچی جیسے علمِ جغرافیہ اور علمِ ہندسہ پہنچا تھا یعنی مصر کے قبطیوں کے ذریعے سے۔ فرید وجدی صاحبِ دائرۃ المعارف لکھتے ہیں کہ علمِ طب' مکتبِ

اسکندریہ کے ذریعے امام جعفر صادقؑ تک پہنچا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ جب امام جعفر صادقؑ تحصیلِ علوم کر رہے تھے اس وقت اسکندریہ کا علمی مکتب موجود نہیں تھا جس سے یہ علم آپؑ تک پہنچتا۔

اسکندریہ کا یہ علمی مکتب اس کتب خانے سے وابستہ ہے جو مصر پر عربوں کے تصرف کے بعد تلف ہو گیا تھا۔ جن لوگوں نے اس کتب خانے کی کتابوں سے نقلیں حاصل کی تھیں شاید ان کے پاس کچھ نسخے موجود رہے ہوں لیکن وہاں کا علمی مکتب کتب خانے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا' البتہ جن لوگوں نے اسکندریہ کے مکتبِ علمی میں تربیت پائی تھی۔ انہوں نے اس کے نظریات کو بالخصوص فلسفۂ افلاطونِ جدید کو اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو سکھایا جن سے نسل در نسل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا۔

اس بات کا احتمال ہے کہ ایک یا چند کتابیں جو کتب خانۂ اسکندریہ سے نقل کی گئی تھیں مصر سے امام جعفر صادقؑ تک پہنچ گئی ہوں اور فرید وجدی کی مراد مکتبِ اسکندریہ سے وہ مکتب نہ ہو جس کا سرچشمہ اس کا کتب خانہ تھا بلکہ وہ کہنا چاہتا ہو کہ "وہ کتاب یا کتابیں جو مکتبِ اسکندریہ کی یادگار کہی جا سکتی ہوں امام جعفر صادقؑ تک پہنچ گئی ہوں۔"

غرضیکہ امام جعفر صادقؑ اپنے والدِ گرامی کے زیرِ تربیت علمِ طبیعیات (Physics) سے آشنا ہوئے اور جس طرح علمِ جغرافیہ میں زمین کے گرد آفتاب کی گردش کا نظریہ باطل کیا' ارسطو کے علمِ طبیعیات کے کچھ حصوں کو بھی رد کیا جب کہ ابھی ان کا سن بارہ سال کو بھی نہیں پہنچا تھا۔

ایک روز اپنے والد اور استاد یعنی امام محمد باقرؑ کے روبرو ارسطو کی طبیعیات کے اس حصے پر پہنچے کہ دنیا میں چار عناصر سے زیادہ موجود نہیں ہیں یعنی پانی' ہوا' آگ اور مٹی۔

امام جعفر صادقؑ نے اعتراض کرتے ہوئے فرمایا مجھے حیرت ہے کہ ارسطو جیسا انسان اس چیز کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوا کہ خاک ایک عنصر نہیں ہے بلکہ اس کے اندر بہت سے عناصر موجود ہیں اور اس میں جتنے فلزات (دھاتیں) ہیں وہ سب ایک جداگانہ عنصر ہیں۔

ارسطو کے زمانے سے امام جعفر صادقؑ کے دور تک تقریباً ایک ہزار سال گزر چکے تھے اور اس طولانی مدت میں عناصرِ اربعہ جس طرح ارسطو نے بتایا تھا کہ علم الاشیاء کے ارکان میں شمار ہوتے تھے کوئی ایسا نہ تھا جو اس کا معتقد نہ ہو اور کسی کے دل میں اس نظریے سے اختلاف کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ لیکن ہزار سال کے بعد ایک بچہ جو ابھی بارہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا بتاتا ہے کہ خاک ایک عنصر نہیں بلکہ متعدد عناصر سے مل کر بنی ہے۔ اس نے جب خود درس دینا شروع کیا تو دوسرے عنصر کے بسیط (غیر مرکب) اور خالص ہونے کو بھی غلط بتایا اور کہا کہ ہوا ایک عنصر نہیں بلکہ چند عناصر پر مشتمل ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے اٹھارویں صدی عیسوی کے علمائے یورپ سے گیارہ سو سال قبل اجزائے ہوا کی تشریح و تجزیہ کرتے ہوئے اس کو چند عناصر سے مخلوط بتایا۔

اگر کچھ لوگ غور و فکر کے بعد یہ مان بھی لیتے تھے کہ خاک ایک عنصر نہیں ہے بلکہ اس میں کئی عناصر ہیں تو اس میں کسی کو شبہ نہیں تھا کہ ہوا کا عنصر ایک ہی ہے۔ ارسطو کے بعد دنیا کے بڑے سے بڑے علماءِ طبیعیات بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ ہوا عنصرِ بسیط نہیں ہے یہاں تک کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں بھی جو علم کا ایک درخشندہ دور تھا لوازیہ کے دور تک بہت سے علماء ہوا کو عنصرِ بسیط سمجھتے تھے اور اس حقیقت پر غور نہیں کرتے تھے کہ یہ چند عناصر سے مخلوط ہے لیکن جب لوازیہ نے آکسیجن کو ہوا کے دوسرے بخارات سے علیحدہ کیا اور وضاحت کی کہ سانس لینے اور جلنے میں آکسیجن کتنا بڑا کام کرتی ہے تو عام طور پر علماء نے تسلیم کیا کہ ہوا بسیط نہیں بلکہ چند بخارات سے مرکب ہے۔ بالآخر ۱۷۹۴ء میں اس جرم کی سزا میں اس کا سر تن سے جدا کر کے جدید علمِ طبیعیات کے باپ کو اس دنیا سے رخصت کر دیا گیا جو اگر زندہ رہتا تو شاید دوسرے انکشافات بھی سامنے آتے۔

(اس مقام پر مستشرقین نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ اب سے گیارہ سو سال قبل یہ اور اسی قبیل کی دوسری علمی باتیں بتانے کی وجہ سے شیعہ کہتے ہیں کہ امام جعفر

صادق علیہ السلام کو علمِ لدنی اور علمِ امامت کے ذریعے یہ معلومات حاصل تھیں۔ لیکن ایک مورّخ کہتا ہے کہ اگر ایسا تھا تو انہوں نے مادے کو انرجی سے بدلنے کا قانون کیوں بیان نہیں کیا جسے اس صدی میں آئن اسٹائن نے معلوم کیا؟ کیونکہ علمِ امامت رکھنے والے کو ہر چیز جاننا چاہئے لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ بشری علم تھا۔ (حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ دلیل کوئی وزن نہیں رکھتی اس لئے کہ یہ ضروری نہیں کہ عالم یا معلم جو کچھ جانتا ہو سب بیان ہی کر دے جیسا موقع یا جیسا سوال ہوتا ہے اسی کے لحاظ سے بیان اور جواب ہوتا ہے۔ ع "ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد" اس کے علاوہ اگر کوئی بات ہم تک نہیں پہنچ سکی ہے تو یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہو سکتا کہ آپ نے اسے کسی سے بیان ہی نہیں فرمایا۔ یہ لازم نہیں ہے کہ آپ کی ایک ایک بات کتابوں میں محفوظ کر لی گئی ہو۔ محمد باقر مترجم اردو)

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ: "ہوا کے اندر کئی اجزاء موجود ہیں اور یہ سب سانس لینے کے لئے ضروری ہیں۔" جب لاوازیہ نے آکسیجن کو ہوا کی دوسری گیسوں سے الگ کیا اور وضاحت کی کہ آکسیجن ہی جانداروں کی زندگی کا ذریعہ ہے۔ تو ماہرین نے ہوا میں شامل دوسری گیسوں کو زندگی کے لئے غیر مفید قرار دیا اور یہ نظریہ امام جعفر صادقؑ کے اس نظریے کا مخالف تھا کہ ہوا میں جتنے اجزاء ہیں وہ سب سانس لینے کے لئے ضروری ہیں۔

لیکن ان علماء نے انیسویں صدی کے نصف میں آکسیجن کے بارے میں اپنے اس نظریے کی تصحیح کی کیونکہ یہ ثابت ہو گیا کہ آکسیجن اگرچہ تمام جانداروں کا سرمایہ زندگی ہے اور ہوا کی ساری گیسوں میں یہی وہ تنہا گیس ہے جو جسم کے اندر خون کو صاف کرتی ہے لیکن کوئی جاندار ایک مدت تک صرف آکسیجن سے سانس نہیں لے سکتا کیونکہ اس کے آلاتِ تنفس کے خلیے اس سے مرکب ہو کر جل جائیں گے۔ آکسیجن خود نہیں جلتی لیکن جلانے میں مدد دیتی ہے۔ اور جب کسی ایسے جسم کے ساتھ شامل ہو جائے جو جلنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو وہ جل جاتا ہے چنانچہ جب انسان یا دیگر حیوانات

کے پھیپھڑے ایک مدت تک خالص آکسیجن کی سانس لیں گے تو چونکہ یہ ان کے خلیوں سے مرکب ہو جائے گی لہٰذا وہ جل جائیں گے۔ اور جس انسان یا جانور کا پھیپھڑا جل جائے تو وہ مرجاتا ہے۔ اس بنا پر لازمی ہے کہ ہوا میں آکسیجن کے ساتھ دوسری گیسیں بھی پھیپھڑوں میں پہنچیں تاکہ ایک طولانی مدت تک آکسیجن کے اثر سے جلنے نہ پائیں۔

جب ان علماء نے سانس کے سلسلے میں آکسیجن کے متعلق اپنے نظریے کو درست کیا تو معلوم ہوا کہ امام جعفر صادقؑ کا نظریہ صحیح ہے اور ہوا کے اندر جتنی گیسیں موجود ہیں وہ سانس کے لیے مفید ہیں مثلاً "اوزون" گیس جس کے فطری خواص آکسیجن ہی کے مانند ہوتے ہیں اور اس کا ہر مالیکول (یعنی مادے کا سب سے چھوٹا جزو) آکسیجن کے تین ایٹم سے وجود میں آیا ہے بظاہر تنفس میں کوئی عمل نہیں رکھتی ہے حالانکہ یہ آکسیجن کو خون میں داخل ہونے کے وقت صحیح حالت پر قائم رکھتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب آکسیجن خون میں پہنچتی ہے تو یہ اس کی نگرانی کرتی ہے کہ آکسیجن اپنے کام سے سبکدوش نہ ہونے پائے یہی سبب ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے اس نظریے کی کہ "ہوا کے جملہ اجزاء سانس کے لئے ضروری ہیں" انیسویں صدی کے نصف سے اب تک تائید کی جا رہی ہے۔

ہوا میں جو گیسیں موجود ہیں ان کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ آکسیجن کو تہ نشین نہیں ہونے دیتیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آکسیجن فضا میں مرکب صورت میں نہیں ہے بلکہ ہوا کے ساتھ مخلوط ہے اور چونکہ یہ ہوا سے زیادہ وزنی ہے لہٰذا قاعدے کے لحاظ سے اسے تہ نشین ہوجانا چاہئے لیکن اگر ایسا ہو جاتا تو زمین کی سطح ایک معین بلندی تک آکسیجن سے ڈھک جاتی اور جو دوسری گیسیں ہوا کے اندر ہیں وہ اس کے اوپر اپنی جگہ بناتیں، نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام جانداروں کے آلاتِ تنفس جل جاتے اور ان کی نسلیں ختم ہو جاتیں۔

دوسرے یہ کہ گھاس بھی نمو نہ پاتی کیونکہ اگرچہ گھاس بھی جاندار کے مانند زندہ

رہنے کے لئے آکسیجن کی محتاج ہے لیکن ساتھ ہی کاربن کی احتیاج بھی رکھتی ہے لہٰذا اگر سطح زمین ایک خاص بلندی تک آکسیجن سے ڈھک جاتی تو کاربن زمین تک نہ پہنچتی اور گھاس نہ اُگتی چنانچہ جو گیسیں ہوا میں شامل ہیں وہ آکسیجن کو تہ نشین ہونے سے روکتی ہیں تاکہ حیوانات اور نباتات کی زندگی ختم نہ ہو۔ امام جعفر صادقؑ پہلے انسان ہیں جنہوں نے عناصرِ اربعہ کے عقیدے کو جو ایک ہزار سال سے مسلّم تھا متزلزل کر دیا اور وہ بھی ایسی عمر میں جب کہ آپ نوجوانی کی حد میں بھی نہیں پہنچے تھے البتہ ہوا کے نظریے کو اس وقت زبان پر لائے جب آپ سنِ رشد کو پہنچے اور درس دینا شروع کیا۔

آج یہ موضوع ہماری نظر میں معمولی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری دنیا میں ایک سو دو عناصر موجود ہیں۔ لیکن ساتویں صدی عیسوی اور پہلی صدی ہجری میں یہ ایک بہت بڑا انقلابی نظریہ تھا اور اس صدی میں انسانی عقل یہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی کہ ہوا ایک خالص اور بسیط (غیر مرکب) عنصر ہے۔ ہم پھر کہتے ہیں اس دور میں اور اس کے بعد کے زمانوں میں اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپ اس علمی اور انقلابی عقیدے نیز ان دوسری چیزوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا جنہیں امام جعفر صادقؑ نے بیان فرمایا اور جن کا آئندہ فصلوں میں ذکر کیا جائے گا۔ البتہ مشرقی ممالک اور مدینے جیسے شہر میں جو پیغمبرِ اسلامؐ کا شہر تھا ایسے علمی نظریات کو بغیر اس خوف کے زبان پر لایا جا سکتا تھا کہ کہنے والے پر کفر کا الزام عائد کر دیا جائے گا۔

اگرچہ دینِ اسلام کے اندر یہ کہنے والے پر کہ ہوا بسیط نہیں ہے کفر کی تہمت نہیں لگتی تھی۔ لیکن بعض قدیم مذاہب میں ایسا قول کفر کی دلیل سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ ہوا کی طہارت کے قائل تھے اور یہ طہارت اس کے بسیط ہونے پر مبنی تھی جیسے پانی کی طہارت بھی ان کے نزدیک اس کے بسیط ہونے سے پیدا ہوتی تھی۔ جس وقت ہم علمِ طبیعیات کی تاریخ پڑھتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ جوزف پرسٹلی نے جو انگلینڈ کا باشندہ تھا (۱۷۳۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گیا۔) آکسیجن کا انکشاف کیا لیکن اس کی خصوصیات کا پتہ نہیں لگا سکا۔ اس کی خصوصیات کو پہچاننے اور پہچنوانے والا لاوازیہ

تھا۔

اس علم کی تاریخ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ آکسیجن کا نام بھی پرسٹلی ہی کا وضع کیا ہوا ہے درحالیکہ اس کا مفہوم پرسٹلی سے پہلے موجود تھا۔ آکسیجن ایک یونانی لفظ ہے جس کے دو جزو ہیں پہلے جزو کے معنی ترشی کے ہیں اور دوسرے جزو کے معنی ہیں پیدا کرنے والا' لہٰذا آکسیجن کے معنی ہوئے ترشی پیدا کرنے والا۔ آکسیجن کا نام ہو سکتا ہے کہ پرسٹلی ہی نے وضع کیا ہو لیکن ترشی پیدا کرنے والے کا مفہوم پہلے سے موجود تھا۔ ہم پرسٹلی کا درجہ گھٹانا نہیں چاہتے کیونکہ یہ روحانی انسان جو پادری کا لباس اتار کے کلیسا سے تجربہ گاہ میں پہنچا اور آکسیجن کا انکشاف کیا ایک نمایاں علمی حیثیت کا مالک تھا۔ اگر یہ سیاست میں داخل نہ ہوتا تو شاید آکسیجن پر اپنی تحقیق جاری رکھ سکتا اور اسے اندازہ ہوتا کہ اس نے کتنا بڑا انکشاف کیا ہے لیکن سیاست نے اسے تجربہ گاہ سے دور کر دیا اور یہ انگلستان میں فرانس کے انقلابیوں کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی ایسی شدید نفرت کا نشانہ بن گیا کہ اپنے وطن میں نہ ٹھہر سکا اور امریکہ ہجرت کر گیا۔ وہاں اس نے چند کتابیں شائع کیں لیکن ان میں سے کوئی آکسیجن کے بارے میں نہ تھی۔ سب سے پہلا انسان جس نے یہ معلوم کیا کہ آکسیجن ترشی پیدا کرنے والی چیز ہے' امام جعفر صادقؑ ہیں۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے اپنے والد کی درس گاہ میں یہ بات سیکھی تھی کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ جب انہوں نے خود درس دینا شروع کیا تب فرمایا کہ ہوا ایک بسیط عنصر نہیں ہے اور قوی احتمال یہی ہے کہ انہوں نے اسی موقع پر یہ استنباط کیا ہو۔ شبہ دور کرنے کے لئے ہم کہتے ہیں کہ "مولد الحموضہ" (یعنی ترشی پیدا کرنے والی) کا نام ان کی زبان پر نہیں آیا تھا البتہ انہوں نے اپنے درس میں فرمایا کہ ہوا چند اجزاء پر مشتمل ہے اور ان میں سے ایک جزو بعض اجسام میں داخل ہو کر اسے متغیر کر دیتا ہے اور ہوا کا یہی جزو جلنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر اس کی مدد نہ ہو تو جلنے کے قابل چیزیں بھی نہیں جلتیں۔

اس نظریے کو خود امام جعفر صادقؑ نے وسعت دی اور پھر اپنی تعلیمات میں فرمایا کہ ہوا میں جو چیز اجسام کو جلانے میں معاون ہوتی ہے وہ اگر ہوا سے الگ ہو جائے اور خالص طور پر ہاتھ آجائے تو اس میں جلانے کی اتنی طاقت ہو گی کہ اس سے لوہا بھی جلایا جاسکتا ہے اس بنا پر پرسٹلی سے ایک ہزار سال قبل اور لاوازیہ سے پہلے امام جعفر صادقؑ نے آکسیجن کی بخوبی تعریف و توصیف کی اور فقط اس کا نام آکسیجن یا مولد الحموضہ نہیں رکھا۔

پرسٹلی نے باوجودیکہ آکسیجن کا انکشاف کیا لیکن یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ لوہے کو جلا دیتی ہے لاوازیہ نے باوجودیکہ آکسیجن کے کچھ خواص اپنے تجربے سے دریافت کئے لیکن وہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ یہ گیس لوہے کو جلا دیتی ہے البتہ امام جعفر صادقؑ ایک ہزار سال قبل ہی اس حقیقت کو سمجھ چکے تھے۔

آج ہم جانتے ہیں کہ اگر لوہے کا کوئی ٹکڑا اتنا گرم کیا جائے کہ سرخ ہو جائے اور اس کے بعد اسے خالص آکسیجن میں ڈبو دیا جائے تو تیز روشنی کا شعلہ دے کر جلنے لگے گا جس طرح کڑوے تیل یا مٹی کے تیل کے چراغ کو دیتے ہیں اور ان کی روشنی سے کام لیا جاتا ہے ایک ایسا چراغ بھی بنایا جا سکتا ہے جس کی بتی لوہے کی ہو اسے سیال آکسیجن میں ڈبو دیا جائے اور اسے اتنی حرارت پہنچائی جائے کہ سرخ ہوجائے تو یہ بتی بہت تیز روشنی کے ساتھ جلنے لگے گی۔

روایت میں ہے کہ ایک دن امام جعفر صادقؑ کے والد امام محمد باقر نے اپنے درس میں فرمایا کہ علم کی مدد سے پانی کے ذریعے جو آگ کو بجھانے والا ہے آگ روشن کی جا سکتی ہے یہ قول اگر بظاہر کوئی شاعرانہ تعبیر معلوم نہ ہوتا ہو تو بے معنی ضرور سمجھا جاتا تھا اور جو لوگ اس روایت کو سنتے تھے ایک مدت تک یہی سوچتے رہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک شاعرانہ استعارہ بیان فرمایا ہے لیکن اٹھارویں صدی عیسوی کے بعد ثابت ہوا کہ علم کی مدد سے پانی کے ذریعے آگ جلائی جا سکتی ہے اور آگ بھی ایسی جو لکڑی یا کوئلے کی آگ سے کہیں زیادہ گرم ہو گی کیونکہ پانی کے دو میں سے ایک جزو

ہائیڈروجن کے آکسیجن کے ساتھ جلنے کی حرارت ۲۲۶۴ ڈگری تک پہنچ جاتی ہے اور آکسیجن کے ساتھ ہائیڈروجن کو جلانے کے عمل کو آکسیڈروجن کہتے ہیں جو دھاتوں کو جوش دینے یا ان کے ٹکڑوں کو توڑنے کی صنعت میں بہت ہی کار آمد ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ امام محمد باقرؑ نے جب یہ کہا کہ علم کے ذریعے پانی سے آگ جلائی جا سکتی ہے تو آپ نے ہائیڈروجن کا انکشاف نہیں کیا تھا اور ہمارے پاس اس بات کی بھی کوئی سند نہیں ہے کہ ان کے فرزند امام جعفرصادقؑ نے خالص حیثیت میں اس کو دریافت کیا تھا اسی طرح اس کی بھی کوئی سند نہیں ملتی کہ آپ نے خالص آکسیجن کا انکشاف کیا' لیکن بلاشبہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امام جعفرصادقؑ نے غیر خالص طور پر آکسیجن کو دریافت کیا اور اس کی دلیل آپ کے وہ کام ہیں جو علمِ کیمیا سے متعلق ہیں۔

آپ کے ان کاموں کا ایک حصہ آکسیجن کی مدد سے انجام پذیر ہوا اور بغیر اس عنصر کی مداخلت کے آپ ان کی تکمیل نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا آپ نے آکسیجن تیار کی البتہ خالص نہیں بلکہ دوسرے عناصر کے ساتھ مرکب صورت میں۔ امام جعفرصادقؑ نے جو نتائج بر آمد کئے وہ تھیوری کی حیثیت سے نہیں تھے بلکہ انہیں میں سے یہ دو فارمولے بھی ہیں جو آپ نے وضع کئے۔

اوّل یہ کہ تنفّس کے لحاظ سے ہوا کا ایک جزو دیگر اجزاء سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور یہ جزو ہوائے حیاتی ہے دوسرے یہ کہ اسی جزو کے سبب زمانہ گزرنے سے اشیاء زیادہ تر بالواسطہ متغیر یا فاسد ہوتی ہیں۔ اس "زیادہ تر بالواسطہ" کے مفہوم کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ امام جعفرصادقؑ آکسیجن کی کیفیت کے بارے میں کتنا تحقیقی اور صائب نظریہ رکھتے تھے۔ انگلستان کے پرسٹلی کے بعد جب فرانس کے لاوازیہ نے آکسیجن کے بارے میں تحقیق کی اور اس کے اثرات کی جانچ کی تو صاحبانِ علم و دانش قائل ہوئے کہ اجسام کا تغیر زمانے کے گزرنے سے اور ان میں سے کسی کسی کا فاسد ہوجانا آکسیجن کی وجہ سے ہے یہاں تک کہ فرانس کے پاسٹور نے میکروب کا انکشاف کیا اور کہا کہ بعض چیزوں کا فاسد ہونا (مثلاً غذائی اشیاء کا مدّت گزرنے پر

خراب ہونا) عام خیال کے برخلاف آکسیجن کی وجہ سے نہیں بلکہ میکروب کے سبب سے ہے۔ میکروب مردہ جانوروں کے جسموں اور غذاؤں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور انہیں فاسد کر دیتے ہیں لیکن پاسٹور کو اس بات پر توجہ کرنا چاہیے تھی کہ میکروب بغیر آکسیجن کے زندہ نہیں رہ سکتے کیونکہ آکسیجن ہی ان کی زندگی کی محافظ ہے لہٰذا جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے ..... آکسیجن اشیاء کے تغیر میں زیادہ تر بالواسطہ اثر انداز ہوتی ہے اور کبھی بلاواسطہ بھی چیزوں کو متغیر کرتی ہے اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب یہ براہ راست دھاتوں کے ساتھ مرکب ہو جاتی ہے۔ اور علمِ کیمیا کی اصطلاح میں اس عمل کو (OXIDATION) کہتے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ کی طرف سے ایک ایسے باریک اور دقیق نظریے کا اظہار بغیر عملی تجربات کے ممکن نہیں تھا لیکن زمانہ اس کا موقع نہیں دے رہا تھا کہ آپ آکسیجن کی تحقیق و شناخت میں ان مراحل سے گزریں البتہ آپ نے اپنے فہم و فراست سے معلوم کر لیا تھا کہ ہوا کا جو حصہ تنفّس کا اصلی عامل ہے اور جو اشیاء کو متغیر کرتا ہے سنگین بھی ہے اور باقی نوعِ بشر کو مزید ایک ہزار سال تک صبر کرنے کی ضرورت تھی یہاں تک کہ لاوازیہ یہ بتائے کہ آکسیجن کا وزن پانی کے نو حصوں میں سے آٹھ حصے ہوتا ہے۔ اور ہر نو کلوگرام پانی میں آٹھ کلوگرام وزن کی آکسیجن ہوتی ہے۔ لیکن حجم کے لحاظ سے پانی میں ہائیڈروجن آکسیجن کی دوگنا ہوتی ہے۔

باوجودیکہ "لاوازیہ" نے آکسیجن کی تحقیقات میں اتنی پیش رفت کی لیکن اس گیس کو سیال نہیں بنا سکا وہ اس کوشش میں ضرور تھا کہ اس کو رقیق بنائے لیکن دو چیزیں اس کے مقصد میں حائل ہو گئیں۔

اوّل یہ کہ اس کے دور میں جو اٹھارویں صدی عیسوی کا آخری زمانہ تھا۔ صنعت و حرفت میں اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتا۔ دوسرے اسے اتنی مہلت ہی نہیں دی گئی کہ اپنا کام پورا کر سکتا۔ اور اس کی جان لے لی گئی۔ اس کے بعد ایک مدت تک ماہرین یہی کہتے رہے کہ آکسیجن کو سیال نہیں بنایا جا سکتا۔

یہاں تک کہ ٹیکنک نے اتنی ترقی پائی کہ بہت زیادہ ٹھنڈک کا وجود میں لانا ممکن ہوا پھر بھی بیسویں صدی عیسوی تک آکسیجن کو زیادہ مقدار میں یعنی اس صورت سے کہ وہ صنعت میں کار آمد ثابت ہو رقیق بنانے میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ بیسویں صدی عیسوی میں شدید قسم کی ٹھنڈک پیدا کرنے کی ٹیکنک میں انیسویں صدی عیسوی سے زیادہ ترقی ہوئی اور درجہ حرارت صفر سے ۱۸۳ ڈگری نیچے گرا کے اضافی دباؤ کے بغیر معمولی ہوا کے دباؤ میں آکسیجن کو مائع کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا۔

آج یہ ممکن ہے کہ آکسیجن کو زیادہ مقدار میں مائع میں تبدیل کرکے صنعتوں میں اس سے فائدہ اٹھایا جائے ۔ صفر سے ۱۸۳ ڈگری نیچے درجہ حرارت کو کم ٹھنڈا نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ مطلق ٹھنڈک سے جس کا دوسرا نام صفر مطلق ٹھنڈک ہے اس کا فاصلہ صرف ۹۰ ڈگری کا ہوتا ہے اور صفر مطلق ٹھنڈک ۲۷۳٬۱۶ ڈگری صفر سے نیچے ہوتی ہے۔ اس ٹھنڈک میں جیسا کہ ماہرین کہتے ہیں مادے کی اندرونی حرکت ساکت ہو جاتی ہے۔

بہرحال زمانے نے موقع نہیں دیا کہ امام جعفر صادقؑ ہوا کے جزوِ حیاتی اور مولدالحموضہ کے بارے میں جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے آگے بڑھیں لیکن آپؑ نے جس قدر دریافت کیا وہ آپ کو آکسیجن کی معلومات میں سب سے مقدّم قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ آپ طبیعیات کے اس شعبہ میں اپنے ہم عصروں سے ایک ہزار سال آگے تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے آپ کے بعد کہا کہ ہوا اور آکسیجن کو مائع بنایا جاسکتا ہے لیکن آپ کے شاگردوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک کلی نظریہ ہے اور زمانۂ قدیم بلکہ ارسطو سے قبل ہی اس کا پتا لگایا جا چکا تھا کہ ہر بخار یا گیس کو مائع بنایا جاسکتا ہے۔ البتہ اس کا ذریعہ دستیاب نہیں تھا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ موجودہ علوم کا ایک حصہ قدیم زمانوں سے تھیوری کی شکل میں سامنے آچکا تھا البتہ اسے عملی جامہ پہنانے کے وسائل موجود نہیں تھے یونان کے "دیمقراطیس" نے ولادتِ مسیح سے پانچ سو سال قبل ایٹم کی تھیوری اسی شکل میں بیان کی تھی جس طرح آج ہم

جانتے ہیں اور کہا تھا کہ مادہ ایٹموں سے بنا ہے اور ہر ایٹم کے اندر تیز اور سریع حرکتیں موجود ہیں۔ اگر ہم الیکٹران ...... پروٹان ..... نیوٹران اور ایٹم کے دیگر اجزاء کے ناموں سے قطع نظر کریں جو انیسویں اور بیسویں صدی کے موضوعات ہیں تو دیمقراطیس نے تھیوری کی حیثیت سے ایٹم کی تعریف میں کوئی فروگذاشت نہیں کی ہے۔ اس کے باوجود بنی نوع انسان اس صدی تک ایٹم سے عملی فائدہ حاصل نہ کرسکے اور اگر دوسری جنگِ عظیم پیش نہ آتی اور جرمنی کے سائنسدان ایٹم کی طاقت سے فائدہ اٹھانے کی فکر نہ کرتے اور امریکہ جرمنی کے خوف سے پیش قدمی کی کوشش نہ کرتا تو شاید اس صدی کے آخر تک بھی ایٹمی طاقت سے عملی استفادہ ممکن نہ ہوتا۔

امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے ہوا یا آکسیجن کو رقیق بنانے کے امکان کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ صرف ایک تھیوری ہے جو پہلے سے موجود تھی لیکن آکسیجن کے سلسلے میں جو باتیں امام جعفر صادقؑ نے فرمائی ہیں وہ تھیوری کی حدود سے تجاوز کر کے اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ آپ کی آکسیجن شناسی عمل کے مرحلے میں داخل ہوچکی تھی۔

---☆---☆---

کیا جدید علمی دور کے موجد امام جعفر صادقؑ ہیں؟

ہم دیکھتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد کے حلقۂ درس میں اس سوال کو اٹھایا کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے جبکہ اسی حال میں بارہ برجوں کو عبور بھی کرتا ہے اور فرمایا کہ اس قسم کی رفتار عقل کے خلاف ہے ہم عنقریب دیکھیں گے کہ امام جعفر صادقؑ نے جو اپنے والد کے بعد مستقل طور پر درس دینے لگے تھے ستاروں کے بارے میں اسقدر نظریات کو رد فرمایا کہ اگر آپ کو تمام علوم کے اندر تجدّد کا پیشوا نہ مانا جائے تو اتنا کہنا ہی پڑے گا کہ آپ علمِ نجوم میں تجدّد کے پیشوا ہیں اور تجدّد سے ہماری مراد عصرِ جدید ہے جس میں علمی روشنی کا سرچشمہ یورپ میں ہے اور جس کا آغاز سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی فتح سے خیال کیا جاتا ہے۔ ماننا پڑے گا کہ علمی تجدّد کے لئے دنیائے اسلام یورپ سے زیادہ آمادہ تھی اور اسلام کی وسیع القلبی نے حقائق کو پہلے ہی قبول کرلیا تھا جب کہ یورپ پندرھویں صدی عیسوی میں جب قسطنطنیہ فتح ہوا اور اس کے بعد سولھویں صدی میں بلکہ سترھویں صدی تک انہیں برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ ان علمی حقائق میں جنہیں کم یا زیادہ سننے کا یورپ متحمل نہیں تھا علمِ نجوم کی حقیقتوں سے زیادہ اور کوئی چیز ناقابل برداشت نہیں تھی۔

یورپ میں اگر کوئی شخص پانی، مٹی یا آگ وغیرہ کے بارے میں کوئی ایسی بات کہتا تھا جو رسم و رواج کے خلاف ہوتی تھی تو اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اگر

ستاروں کے متعلق کوئی نئی بات کہہ دیتا تو اس کے لئے بہت خطرناک صورت پیش آسکتی تھی اور مرتد ہونے کے جرم میں اسے قید یا قتل کردیا جاتا تھا۔ علمِ نجوم کے حقائق کے سلسلے میں یونان اور قدیم روم کے اندر بھی حسّاسیت موجود تھی باوجودیکہ قدیم یونان کو علم کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ چنانچہ "پلی نیوس" لکھتا ہے کہ اناگزاگورس کو اصرار تھا کہ وہ یونان میں ایرانی علم و نجوم کا درس دے گا اور اسی بناء پر اسے یونان کے ساتھ خیانت کرنے کے الزام میں جلاوطن کردیا گیا۔

سمجھ میں یہ آتا ہے کہ مختلف اقوام یہاں تک کہ یونانیوں جیسی قوم کا علمی حقائق کے بارے میں اس قدر حسّاس ہونے کا سبب یہ تھا کہ لوگوں نے ستاروں کی حرکات چونکہ اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں لہٰذا انہیں یقین تھا کہ جو کچھ انہیں نظر آرہا ہے وہی حقیقت ہے۔

چونکہ ستاروں کی حرکات تمام لوگوں کے مشاہدے میں آتی تھیں اور محسوس ہوتی تھیں لہٰذا وہ کسی سے یہ سن ہی نہیں سکتے تھے کہ یہ حرکات حقیقت سے عاری ہیں۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ مشرق و مغرب میں دیگر علمی مسائل کے سلسلے میں کچھ باتیں رواج کے خلاف کہی گئی ہیں مثلاً حرکت کے بارے میں کہ آیا حرکت تھی اور دنیا بعد میں پیدا ہوئی! یا دنیا پہلے وجود میں آئی اور حرکت بعد میں پیدا ہوئی؟ لوگوں نے ایسی باتیں کہیں جو مروّجہ خیالات کے خلاف تھیں۔ یا روح و جسم کے بارے میں کہ پہلے روح پیدا ہوئی اور اس نے جسم کو وجود بخشا یا پہلے جسم ایجاد ہوا اور اس کے بعد روح وجود میں آئی۔ کافی باتیں پرانے خیال کے خلاف کہی گئی ہیں لیکن کسی جدید نظریہ کے پیش کرنے والے اور نئی بات کہنے والے پر ایک بار بھی کفر و ارتداد کا الزام عائد نہیں کیا گیا۔

چونکہ لوگ ان چیزوں کو جن پر عقیدہ چلا آرہا تھا نہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے اور نہ محسوس کرسکتے تھے لہٰذا اگر کوئی شخص حرکت یا روح کے متعلق سنّت کے خلاف باتیں کہتا تھا تو اس پر کفر کا الزام نہیں لگتا تھا سوائے ان باتوں کے جو اصولِ دین مثلاً

توحید یا نبوّت کی مخالفت میں ہوں۔

یونانی عالم اور فلسفی اناگزیمن جس کا زمانہ حیات ساتویں صدی قبل مسیح میں تھا اور اس کے حالات زندگی سے ہم زیادہ واقف نہیں ہیں کہتا تھا کہ سورج ایک پگھلی ہوئی اور زمین سے بہت بڑی چیز ہے جو ہمیں اس لئے چھوٹا نظر آتا ہے کہ ہم سے کافی دور ہے۔ اگر یہ زمین سے بڑا نہیں ہوتا اور پگھلا ہوا ہونے کے سبب کافی گرم نہ ہوتا تو ساری زمین کو روشن نہ کرسکتا اور ہم اس کی حرارت کو محسوس نہ کرسکتے۔

ساتویں صدی قبل مسیح کے فلسفی کا یہ قول ایک ایسی چیز ہے جو سورج کے متعلق ہماری آج کی معلومات کے مطابق ہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ سورج اس قدر پگھلا ہوا ہے کہ گیس کی شکل رکھتا ہے۔ یہ نظریہ یونان سے بابل پہنچا لیکن وہاں جو شخص یہ کہتا تھا کہ سورج ایک پگھلا ہوا مادہ اور زمین سے بڑا ہے تو کافر قرار پاتا تھا کیونکہ ان کے اصول اور عقیدے کے مطابق سورج بڑے بت (یعنی بابل کے سب سے بڑے بت) کا چراغ تھا جسے وہ ہر صبح کو روشن کرتا تھا اور شام کو بجھا دیتا تھا اور اناگزیمن کا نظریہ اس بابلی عقیدے سے متصادم تھا۔ اناگزیمن دنیا کی پیدائش کے بارے میں کہتا تھا کہ ہوا تمام موجودات کا مبداء ہے اور ہر چیز ہوا سے حاصل ہوتی ہے۔ بابل میں جو شخص اس کے نظریے کو قبول کرتا تھا وہ کافر ہوجاتا تھا اور پھر بابل کی عظیم عبادت گاہ کے دروازے اس کے لئے بند ہوجاتے تھے اور اسے ملکی معاملات میں بھی شامل نہیں کیا جاتا تھا۔

"او میستمڈ" نے اپنی کتاب (مسیح تاریخ کی روشنی میں) میں بابل کے دو دانشمندوں کے نام لئے ہیں جنھوں نے اناگزیمن کا نظریہ قبول کیا تھا لہٰذا حکومت کے معاملات سے معذول کئے گئے اور زندگی ان کے لئے اتنی دشوار ہوگئی تھی کہ مجبوراً انہیں بابل سے نکلنا پڑا۔

یونان کے دانشمند اور فلسفی اناگز۔منڈر نے بھی دنیا کی پیدائش کے بارے میں ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو اہلِ بابل کے رسمی عقیدے سے متصادم تھا۔

اناگز۔منڈر (جو ۶۱۱ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۵۴۷ قبل مسیح میں فوت ہوا) کہتا تھا

ابتداء میں ہستی یا وجود' زمانے کے اعتبار سے لامتناہی اور مکان کے لحاظ سے لامحدود شے تھی جس کی تعریف کسی طرح ممکن نہیں۔

اسی ناقابلِ توصیف شے کے کچھ حصے آپس میں جمع ہوئے جس کے نتیجے میں جرم پیدا ہوا اور پھر اسی جرم سے اجسام وجود میں آئے اناگز۔منڈر نے کہا کہ اس ناقابلِ توصیف شے کا باہمی اجتماع' ایک معیار اور اندازے پر نہیں تھا ایک حصے کا اجتماع زیادہ شدید تھا جس سے پتھر اور دھاتیں پیدا ہوئیں اور دوسرے کا خفیف و کمتر تھا جس کی وجہ سے نباتات و حیوانات اور انسان وجود میں آئے پھر تیسرے حصے کا اس سے بھی کم اور ہلکا تھا چنانچہ اس سے پانی اور ہوا کی پیدائش ہوئی ہم دیکھتے ہیں کہ چھٹی صدی قبل مسیح کے اس یونانی فلسفی نے دنیا کی خلقت کے بارے میں وہی کچھ کہا تھا جو آج دوہزار چھ سو سال کے بعد ہم کہہ رہے ہیں۔

ہمارے اس دور کے علمِ فزکس کے بڑے بڑے ماہرین کہتے ہیں کہ دنیا کی ابتداء میں صرف ہائیڈروجن تھی لیکن جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ہائیڈروجن کس چیز سے پیدا ہوئی تو ان کا جواب وہی اناگزیمنڈر کا نظریہ ہوتا ہے وہ ہمیں یہ نہیں سمجھا سکتے کہ پہلی غیر محدود اور لامتناہی شے جس سے ہائیڈروجن پیدا ہوئی کیا تھی اور کیا ہے؟ کیونکہ قوی احتمال یہی ہے کہ وہ ناقابلِ تعریف شے اب بھی موجود ہے اور ہائیڈروجن کو پیدا کرتی رہتی ہے اگر وہ ہماری کہکشاں ـــ (جس کا ایک جزو سورج اور نظام شمسی بھی ہے) میں نہ پائی جائے تو دوسری کہکشاؤں میں پائی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ آج فزکس اور آسٹروفزکس یعنی ستاروں کی طبیعیاتی شناخت کی اتنی ترقی کے بعد بھی علمِ طبیعیات کے اعتبار سے دنیا کے آغاز کے بارے میں ہمارا نظریہ چھٹی صدی عیسوی کے یونانی فلسفی کے نظریے کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ہائیڈروجن کا ایک ایٹم جو دیگر عناصر کے ایٹموں میں سب سے ہلکا ہے ایک الیکٹران اور ایک پروٹان کا حامل ہوتا ہے الیکٹران پروٹان کے گرد گردش کرتا ہے اور ابھی تک کوئی طبعی نظریہ ابتدائی ناقابلِ توصیف شے کی تبدیلی کے علمی قانون کو الیکٹرون اور پروٹون

پر روشن نہ کرسکا یعنی اس کے علمی قانون کا ابھی تک کوئی سراغ نہ لگا سکا اور ہم یہ نہیں بتاسکتے کہ الیکٹرون اور پروٹون میں پہلے کون سی شے وجود میں آئی یا وہ دونوں ایک ساتھ ہی نمودار ہوئے' وہ کیا صورت تھی جہاں یہ مثبت و منفی چارج رکھنے والی طاقتیں اس ناقابلِ توصیف ابتدائی شے سے اچانک ظہور پذیر ہوئیں' انیسویں صدی عیسوی سے آج تک اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ محض ایک تھیوری ہے اور ہم آغازِ آفرینش کے بارے میں بس اتنا ہی جانتے ہیں جتنا "اناگزیمنڈر" کے دور کے اہلِ یونان جانتے تھے' اناگزیمنڈر کا نظریہ سابق یونانی فلسفی اناگزیمن کے نظریے کے مانند بابل پہنچا اور کچھ لوگوں نے اسے قبول کیا لیکن کسی کے اوپر اس نظریے کے دلائل قبول کرنے کی وجہ سے کفر کی تہمت نہیں لگی اور وہ ملکی معاملات سے بے دخل نہیں کیا گیا کیونکہ بابل والے نظریۂ اناگزیمنڈر کے باطل ہونے کی دلیل اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے تھے اور ان سے قبل بھی کسی شخص نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ دنیا کس طرح پیدا ہوئی۔

البتہ وہی لوگ ہر صبح اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ سورج روشن ہورہا ہے اور پھر شام کو مشاہدہ کرتے تھے کہ وہ خاموش ہورہا ہے لہٰذا اناگزیمن کے نظریے کو تسلیم نہیں کرسکتے تھے کہ سورج ایک پگھلا ہوا جسم ہے اور زمین سے بڑا ہے وہ چونکہ ہر صبح و شام سورج کو روشن اور خاموش ہوتے ہوئے دیکھتے تھے لہٰذا یقین رکھتے تھے کہ بابل کا بڑا خدا اسے جلاتا اور بجھاتا ہے اور اگر بقول یونانی فلسفی کے ایک پگھلا ہوا اور زمین سے بڑا جسم ہوتا تو روشن اور خاموش نہ ہوتا۔ رہا اناگزاگورس جو ایرانی علمِ نجوم کی تعلیم دینے کے جرم میں یونان سے نکالا گیا تو اس کا قصور سورج سے متعلق نہیں تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ ایرانی کلینڈر کو یونان میں رائج کرے وہ کلینڈر جس کے مطابق سال کے کچھ زائد ۳۶۵ دن مانتا تھا اور اس کے مہینوں کے کچھ نام بے ستون کے کتبہ پر لکھے ہوئے ہیں۔ ایران میں ہخامنشی دور کے بعد سے کوئی کتبہ اتنی تفصیل کے ساتھ نہیں پایا جاتا۔ ۳۶۵ سے کچھ زائد دنوں کا سال ایران کی مدون تاریخ سے قبل ہی معلوم کیا جاچکا تھا موجودہ تاریخ کی اسناد پتہ دیتی ہیں کہ قدیم مصری لوگ دوہزار سال قبل مسیح یہ نہ

جانتے تھے کہ سال ۳۶۵ سے کچھ زائد دنوں کا ہوتا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ آیا ابتدا میں بابلیوں نے اس کی تحقیق کی یا مصریوں نے اور شاید جیسا کہ بعض اہلِ نظر کا قول ہے کہ علمِ نجوم و ہیئت اور دیگر علوم کسی ایک دانشمند قوم سے دوسری قدیم قوموں تک پہنچے اور وہ قوم بقول افلاطون کسی قدرتی حادثے کی بنا پر ختم ہو گئی بہرحال دوسری صدی ہجری کے ابتدائی نصف حصے میں جب امام جعفر صادقؑ نے درس دینا شروع کیا تو سورج کے بارے میں انسانوں کی معلومات مذکورہ تشریح کے مطابق تھیں اور جس ملک میں جو شخص مروّجہ عقیدے کے خلاف سورج کے متعلق کوئی جدید نظریہ پیش کرتا تھا اسے مرتد قرار دے دیا جاتا تھا لیکن اسلامی دنیا میں رہنے والے لوگ سورج کے متعلق عام تصوّر یا سنّت سے ہٹ کر جو چاہتے کہتے اور جس طرح چاہتے اظہارِ رائے کرتے تھے اسی وجہ سے جب امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ زمین گھومتی ہے اور یکے بعد دیگرے روز و شب اسی گردش کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں تو کسی نے آپؑ پر تہمت لگانے کی کوشش نہیں کی۔

گزشتہ ابواب میں ہم نے دیکھا کہ زمین کی گردش کا خیال یونان کے اندر "اقلیدس" کے دماغ میں آیا لیکن وہ اس بات کی طرف متوجہ نہیں تھا کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے بلکہ وہ کہتا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اور یہ بات اس وقت کہی گئی جب لوگ اپنے مشاہدات اور محسوسات کے خلاف کوئی بات قبول کرنے پر تیار نہ تھے ایسے حالات میں اقلیدس کا یہ قول اس کی عالی دماغی کی دلیل ہے۔

زمین کا گول ہونا بھی وہ علم ہے جس کو نوعِ بشر ہزار سال قبل مسیح سے جانتی ہے اور مصری لوگ اس حقیقت سے باخبر تھے۔

مصریوں کے بعد عربوں کو زمین کے گول ہونے کا علم حاصل ہوا پانچویں صدی ہجری میں جغرافیائی نقشے تیار کرنے والا عرب کا مشہور جغرافیہ داں "الادریسی" اس بات کو جانتا تھا کہ زمین کی شکل گول ہے۔ البتہ اس بات کی تحقیق کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گھومتی ہے ایک ایسا خیال تھا جو عام افراد کے دماغوں میں نہیں سما سکتا تھا اور صرف

وہی شخص یہ نظریہ قائم کرسکتا تھا جو غیر معمولی فہم و فراست کا مالک ہو' فطرت بہت سے انسانوں کو غیر معمولی فہم و فراست عطا کرنے میں بخل سے کام لیتی ہے اور صرف اسی شخص کو اس کا حامل تسلیم کیا جاسکتا ہے جو بغیر کسی وسیلے کے کسی ایسی حقیقت تک رسائی حاصل کرلے کہ اس کے قبل ہر شخص اس کے برعکس چیز کو حقیقت سمجھتا رہا ہو۔

---☆---☆---

زمین کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کا نظریہ

جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ پرانے زمانے ہی سے انسان کو یہ معلوم تھا کہ زمین گول ہے' پرتگال اور اسپین کے تمام بحری سیّاح جنہوں نے پندرہویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصے اور پوری سولہویں صدی میں تحقیقات و انکشافات کے لئے سمندر کا سفر اختیار کیا اس سے واقف تھے کہ زمین گول ہے۔اس مقام پر ہم یہ بھی کہتے چلیں کہ پندرہویں صدی کا آخری نصف زمانہ اور پوری سولہویں صدی دنیا کی پوشیدہ چیزیں دریافت کرنے کے سلسلے میں اس صدی کے مقابل جبکہ آدمی چاند کے اوپر قدم رکھ چکا ہے زیادہ دلچسپ اور قابلِ توجہ تھی اگر ہم پرتگال کے "واسکوڈے گاما" کا سفر نامہ پڑھیں جس نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا تو اس کے سامنے چاند کی جانب پرواز کرنے والے فضائی راکٹ (اپولو) کی داستانِ سفر پھیکی نظر آتی ہے۔

اگر "ماجلان" کا سفرنامہ پڑھاجائے اور دیکھا جائے کہ اس کے قافلے کے ۲۶۸ افراد زمین کے گرد تین سال کے سفر میں کس قدر مصیبتوں اور پریشانیوں میں گرفتار ہوئے اور ان میں سے صرف ۱۸ افراد واپس لوٹے تو سمجھ میں آتا ہے کہ اپولو جہازوں کا سفر واقعات کے لحاظ سے اس کے مقابلے میں ہلکا ہے۔ ہندوستان کے بحری راستے کا پتہ لگانے والا واسکوڈے گاما' امریکہ کا انکشاف کرنے والا کرسٹوفر کولمبس اور "ماجلان" زمین کے گرد چکر لگانے والا سب سے پہلا سیّاح سبھی جانتے تھے کہ زمین گول ہے لیکن ان

میں سے کسی نے بھی کوئی نیا انکشاف کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ ان کا مقصد صرف مادی فوائد حاصل کرنا تھا۔ ان تینوں افراد کی نمایاں حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ جاننے کے بعد بھی کہ زمین گول ہے ان کے سفرناموں سے کسی ایسی بات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ اس بات سے بھی واقف رہے ہوں کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے یہاں تک کہ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اٹلی کا گیلیلیو بھی زمین کی اپنے گرد گردش سے واقف تھا یا نہیں؟

گیلیلیو ایک منجم، ریاضی دان اور علمِ فزکس پر دسترس رکھنے والا ماہر دانشمند تھا، ترقی یافتہ علوم کا ایک حصہ اس کے دریافت کردہ علمی قوانین کا مرہونِ منّت ہے اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس نے امریکہ کی دریافت کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد وفات پائی البتہ قوی احتمال یہی ہے کہ وہ بھی زمین کی اپنے گرد گردش کے بارے میں لاعلم تھا اور جس روز محکمۂ تفتیشِ عقیدہ (Inquisition) نے اس کو توبہ اور استغفار پر مجبور کیا تو یہ اپنے گرد زمین کی گردش کے نظریے کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس کے اس قول کی وجہ سے تھا کہ "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے"۔

"ماجلان" کے ستاون (۵۷) سال بعد ایک انگریز بحری سیاح فرانس ڈریک نے بھی مادی فوائد کے پیش نظر دنیا کے گرد چکر لگانا شروع کیا اور اس نے یہ سفر ۱۵۸۰ء میں مکمل کیا۔

جب اس انگریز سیاح نے اپنا سفر شروع کیا تو ہر کس و ناکس کو زمین کے گول ہونے کا علم تھا۔ لیکن وہ زمین کی اپنے ہی گرد گردش سے بے خبر تھا اور سورج کے طلوع و غروب کو زمین کے گرد سورج کی گردش کا نتیجہ سمجھتا تھا حالانکہ وہ اپنے زمانے میں دانشور شمار کیا جاتا تھا۔

یہ سمجھنے کے لئے کہ اپنے گرد زمین کی گردش کا مسئلہ قبول کرنا لوگوں کے لئے کس قدر دشوار تھا ہم دیکھتے ہیں کہ فرانس کا ہنری پوانکارہ بھی اس بات کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس نے ۱۹۱۲ء میں ۵۸ سال کی عمر میں انتقال کیا اور یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا ریاضی

واں تھا!اس کی تاریخِ وفات بتاتی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں موجود تھا۔ پھر بھی شوخی کے ساتھ کہتا تھا کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ زمین اپنے گرد چکر لگا سکتی ہے۔ جب ہنری پوانکارہ جیسا دانشمند بیسویں صدی کے آغاز میں اس نظریے کی تردید کرے تو ظاہر ہے کہ دوسری صدی ہجری کے ابتدائی حصے کے لوگ بدرجہ اولیٰ اسے تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔

زمین کی اپنے گرد گردش محسوس طریقے سے اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکی جب تک انسان نے چاند پر قدم نہیں رکھے اور وہاں سے زمین کا مشاہدہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ خلا نَوَردْ اپنی خلانَوَردی کے ابتدائی برسوں میں بھی زمین کی گردش اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ اس دور میں ان کا کوئی مستقل اڈا نہیں تھا اور وہ ایسے جہازوں میں تھے جو ہر نوّے منٹ یا اس سے کچھ زائد میں زمین کا چکر پورا کر لیتے تھے اور وہ اس تیز رفتاری کے عالم میں زمین کی حرکت اور کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے چاند کو اپنا ٹھکانا بنایا اور وہاں سے اپنی تصویر بردار دوربین کے ذریعے زمین کا معائنہ کیا تو نظر آیا کہ یہ آہستہ آہستہ اپنے گرد گھوم رہی ہے اور اس روز پہلی بار زمین کی گردش کا مشاہدہ ہوا۔

آج ہم جانتے ہیں کہ نظامِ شمسی میں کوئی ایسا ستارہ نہیں ہے جو اپنے گرد گھومتا نہ ہو، اور ان تمام ستاروں کی اپنے گرد حرکت نظامِ شمسی کے میکانیکی قوانین کی پابند ہے چنانچہ سورج بھی جو نظامِ شمسی کا مرکز اور ناظم ہے اپنے گرد گھومتا ہے اور اس کی یہ حرکت خطِ استواء میں زمین کے ۲۵ شب و روز کی مدت میں مکمل ہوتی ہے۔

جو قانون نظامِ شمسی میں ستاروں کو ان کے گرد چکر دیتا ہے وہی خلائی جہازوں کو بھی گردش دیتا ہے گیلیلو نے فلکی دوربین ایجاد کرنے کے بعد جب ان سیّاروں کا معائنہ کیا تب اس چیز کی طرف متوجہ ہوا کہ یہ اپنے گرد گھوم رہے ہیں اس بات کے پیشِ نظر گیلیلو اس سے بخوبی آگاہ تھا کہ زمین نظامِ شمسی کے دیگر سیّاروں کی مانند سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے لیکن ہمیں اس کے اقوال و آثار میں ایسے کسی خیال کا پتہ

نہیں ملتا' آیا اس دانشور نے محکمہ ٔتفتیشِ عقیدہ کے ڈر سے یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے؟ اس لئے کہ اگر توبہ اور استغفار کے بعد زمین کی اس حرکتِ وضعی کا ذکر کرتا تو اس توبہ شکنی کی وجہ سے پھر اسے کوئی شخص زندہ آگ میں جلائے جانے سے نہ بچا سکتا کیونکہ مذکورہ محکمے کی نظر میں اس کی بدنیتی ثابت ہو جاتی۔

گیلیلیو نہ صرف اپنی طولِ حیات میں اس مسئلہ پر خاموش رہا بلکہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے کاغذات سے کوئی ایسا مواد ہاتھ نہ آیا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اسے زمین کی اپنے گرد گردش کا علم تھا۔

سولھویں صدی عیسوی میں ڈنمارک کی سرزمین پر تیخو براھہ یا ٹیکو براھہ نامی ایک اور علمِ ھیئت کا ماہر دانشمند بھی زمین کی اپنے گرد گردش کا قائل تھا۔ اس کا شمار شرفاءِ ڈنمارک میں کیا جاتا تھا اور نانِ شبینہ کے محتاج "کوپرنیک" کے برخلاف بڑی پُر تکلّف زندگی بسر کرتا تھا۔ اور اپنے محل میں بہت پرشکوہ انداز میں دعوتوں کا انتظام کیا کرتا تھا۔

اس نے ۱۶۰۱ء یعنی سترھویں صدی عیسوی کے پہلے سال میں وفات پائی یہ وہی شخص تھا جس کے نجومی مطالعات نے جرمنی کے کیپلر کی بہت مدد کی۔کیپلر ٹیکو براھہ کے بغیر سیّاروں کی حرکت کے متعلق اپنے تین مشہور قوانین کو جن میں سورج کے گرد زمین کی حرکت بھی شامل ہے پیش نہیں کر سکتا تھا اس کے باوجود ٹیکو براھہ زمین کی اپنے ہی گرد گردش کا پتہ نہیں لگا سکا۔ اگر اسے علم ہوتا تو وہ اس کا اسی طرح اظہار کرتا جس طرح کھل کر اس نے سورج کے گرد زمین کی گردش کا اعلان کیا تھا۔ ٹیکوبراھہ ایسے ملک کا باشندہ تھا جہاں (ڈنمارک) محکمہ ٔتفتیشِ عقیدہ کی کوئی شاخ یا نمائندہ موجود نہیں تھا لہٰذا اگر وہ ایسی تحقیق کر سکا ہوتا تو بے خوف و خطر اس کا اعلان کر دیتا۔

کوپرنیک اور کیپلر نے بھی سورج کے گرد زمین کی گردش سے متعلق اپنا نظریہ اسی وجہ سے برملا بیان کردیا کہ ان کا علاقہ محکمہ ٔتفتیشِ عقیدہ کے اختیار سے باہر تھا۔

جس زمانے میں محکمہ ٔتفتیشِ عقیدہ شدّت کے ساتھ اس نظریے کے اظہار سے روکتا تھا اسی دور میں مخربِ اخلاق اور نفرت انگیز کتابیں کھلے عام دستیاب تھیں لیکن یہ

محکمہ نہ انہیں ممنوع قرار دیتا تھا نہ ان کے مصنفین سے کوئی باز پرس کرتا تھا۔ جرمنی کے کیپلر (متوفی ۱۶۳۰ء) نے ستاروں کی رفتار کے بارے میں جو تین قانون بتائے تھے۔ وہ نہ صرف اس دور کی علمی دنیا کے لئے حیرت و تحسین کا باعث بنے بلکہ آج بھی ہر شخص اس کے تین نکاتی قانون کو پڑھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ان قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ سورج کے گرد زمین سمیت تمام سیاروں کی حرکت "کوپرنیک" کے نظریہ کے برخلاف دائرہ کی شکل میں (مدور) نہیں ہے بلکہ وہ بیضوی صورت میں سورج کے گرد گردش کرتے ہیں اور سورج دو بیضی "کانوں" میں سے ایک کانوں (مرکز) میں مقیم ہے۔

کیپلر کے دریافت کردہ تینوں قوانین پر بحث کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم ستاروں کے بارے میں ایسی بحث کا سلسلہ شروع کر دیں۔ جس کی تفصیل ہمارے محترم قارئین کے لئے تھکاوٹ کا باعث ہو ـــ اس موجودہ صدی کے آخری نصف حصے میں جب کہ آسمان کی طرف خلائی جہازوں کا سفر ایک معمول بن چکا ہے کیپلر کے پہلے قانون کی حقیقت ثابت ہو گئی ہے کیونکہ یہ راکٹ یا جہاز جو انسان کے ہاتھوں فضاء میں بھیجے جاتے ہیں زمین یا چاند کے گرد ایک بیضوی مدار کو طے کرتے ہیں۔ یہ عظیم دانشور بھی جس نے ستاروں کے تین قوانین کاانکشاف کر کے اپنی برتری ثابت کی لیکن زمین کی اپنے گرد گردش کے بارے میں معلوم نہ کر سکا۔

لیکن امام جعفر صادقؑ نے آج سے بارہ سو سال پہلے یہ معلوم کر لیا تھا کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے اور یکے بعد دیگرے شب و روز کی آمدورفت کا سبب زمین کے گرد آفتاب کی گردش نہیں (کیونکہ یہ عقلاً قابلِ قبول نہیں ہے) بلکہ اپنے گرد زمین کی گردش ہے جس سے رات اور دن وجود میں آتے ہیں اور ہمیشہ نصف زمین تاریک اور رات کی حالت میں اور دوسرا نصف حصہ روشن اور دن کے عالم میں رہتا ہے۔قدما جو زمین کے گول ہونے کے قائل تھے یہ جانتے تھے کہ ہمیشہ زمین کے نصف حصے میں رات اور دوسرے نصف حصے میں دن رہتا ہے لیکن وہ شب و روز کو زمین کے چاروں

طرف سورج کی گردش کا نتیجہ سمجھتے تھے۔

آخر کیا بات تھی کہ امام جعفر صادقؑ نے آج سے بارہ سو سال پہلے ہی پتہ لگا لیا کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے اور اسی سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں؟

پندرھویں، سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی کے دانشور جن میں سے بعض کے نام لئے جا چکے ہیں باوجودیکہ ستاروں کے چند میکانیکی قوانین دریافت کر چکے تھے لیکن اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکے کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے پھر امام جعفر صادقؑ مدینے جیسے دور افتادہ علاقے میں رہ کر جو اس دور کے علمی مراکز سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ کیونکر یہ دریافت کر سکے کہ زمین اپنے گرد گردش کرتی ہے۔

اس زمانے کے علمی مراکز قسطنطنیہ، انطاکیہ اور گندی شاپور تھے اور اس وقت تک بغداد علمی حیثیت سے اتنی اہمیت کا حامل نہیں تھا کہ اس کو مرکزیت حاصل ہوتی اور ان مذکورہ بالہ تینوں مراکز میں کوئی یہ معلوم نہ کر سکا کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں روز و شب کا ظہور ہوتا ہے۔

آیا امام جعفر صادقؑ جنہوں نے اس علمی حقیقت کو معلوم کیا۔ ستاروں کے میکانیکی قوانین سے باخبر تھے؟ اور جانتے تھے کہ قوتِ جاذبہ کا اثر جو دو شکلوں میں یعنی ایک مرکز سے فرار کی صورت میں اور دوسرے مرکز کی طرف جذب و کشش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اس چیز کا سبب بنتا ہے کہ اجرامِ فلکی اپنے گرد گردش کریں؟

اس لئے کہ یہ بات عقل سے بعید ہے کہ آپؑ جذب و فرار کے قانون کو جانے بغیر زمین کی اپنے گرد گردش کی حقیقت کو جان سکیں۔

---☆---☆---

امام جعفر صادقؑ کی نظر میں خلقت کا مسئلہ

اگر یہ کہا جائے کہ زمین کی حرکت کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کی یہ تحقیق فہم و فراست کی بناء پر تھی کیونکہ اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ بعض اشخاص اپنی عقل سے کوئی فتویٰ لگاتے ہیں اور بعد میں وہ بات حقیقت کے مطابق نکلتی ہے تو یہ سوال سامنے آتا ہے کہ آپ کے بعد اتنی صدیوں کی طویل مدت میں کسی اور نے اپنی عقل سے یہ کیوں نہیں کہا کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے؟ اس بناء پر ثابت ہوتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے پہلے ستاروں کے میکانیکی قوانین سے واقفیت حاصل کرلی تھی تاکہ ان سے زمین کی اپنے گرد حرکت کا پتہ لگایا جاسکے اگر آپ نے ان قوانین کو دریافت نہ کیا ہوتا تو زمین کی اس گردش کا ادراک نہیں کرسکتے تھے کیونکہ اس موضوع کی تحقیق اتفاقی نہیں ہوسکتی' یہاں علت سے معلول کا پتہ لگایا جاتا ہے۔

البتہ آپ نے اس علت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے جس کے سبب زمین کی اپنے گرد گردش کی حقیقت آپ پر منکشف ہوئی' حالانکہ فزکس کے بعض مسائل کے سلسلے میں آپ نے ایسی چیزیں بیان فرمائی ہیں جو تخلیقِ کائنات کے سلسلے میں موجودہ دور کی تھیوری کے عین مطابق ہیں اور اس دور کے علمِ فزکس کا ایک دانشمند جب امام جعفر صادقؑ کی تھیوری کو پڑھتا ہے تو وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ تخلیقِ کائنات کے سلسلے میں آپؑ کا نظریہ فزکس کی جدید تھیوری کے عین مطابق ہے۔

تخلیقِ کائنات کا نظریہ ابھی علمی قانون کی صورت اختیار نہیں کر سکا ہے اور جو کچھ کہا گیا ہے وہ محض ایک تھیوری ہے ممکن ہے کہ صحیح ہو اور ہو سکتا ہے کہ غلط ہو۔

پیدائشِ دنیا کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کی تھیوری بھی اسی انداز پر ہے اور علمی قانون کی حیثیت میں سامنے نہیں آئی ہے جس سے اسے ایک ناقابلِ تردید حقیقت سمجھا جائے البتہ یہ خصوصیت ضرور رکھتی ہے کہ باوجودیکہ بارہ سو سال قبل پیش کی گئی تھی لیکن فزکس کی جدید تھیوری سے مطابقت رکھتی ہے۔

امام جعفر صادقؑ تخلیقِ کائنات کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ دنیا ایک جرثومے سے پیدا ہوئی ہے وہ جرثومہ دو متضاد قطبوں کا حامل ہے جس سے ذرے کی پیدائش ہوئی پھر مادہ وجود میں آیا اور اس میں تنوع پیدا ہوا اور مادے کا تنوع اس کے ذرّات کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تخلیقِ کائنات کی یہ تھیوری آج کی جدید ایٹمی تھیوری سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

دو متضاد قطب دراصل ایٹم کے دو مثبت اور منفی چارجز ہیں اور یہی دو چارجز ایٹم کو وجود میں لانے کا باعث بنے پھر ایٹم سے مادہ وجود میں آیا۔ عناصر کے درمیان پایا جانے والا فرق ان چیزوں کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے جو ان کے جوہروں میں موجود ہے۔

پچھلے صفحات میں ہم نے دنیا کی پیدائش کے بارے میں پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح کے بعض یونانی فلسفیوں کے نظریات کو ملاحظہ کیا اور یہ بھی دیکھا کہ "ڈیموکریٹ" (دیمقراطیس) نے تخلیقِ کائنات کے سلسلہ میں ایٹم کے نظریہ کو پیش کیا۔ ممکن ہے امام جعفر صادقؑ کو اس یونانی فلسفی کی تھیوری کا علم ہو اور آپ نے اپنے نظریہ کو اسی تھیوری کی اساس پر موقوف فرمایا ہو۔

اگر امام جعفر صادقؑ قدیم یونان کے فلسفیوں کے نظریات سے باخبر تھے تو وہ نظریات اسی ذریعے سے وہاں پہنچے ہوں گے جس ذریعے سے جغرافیہ اور ہندسہ مدینے تک پہنچا یعنی مصری علماء اور قبطی فرقے کے توسط سے۔

ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ چونکہ امام جعفر صادقؑ کو پیدائش کے بارے میں ان تھیوریز

سے واقفیت تھی جنہیں قدیم یونانی دانشمندوں نے آپ سے بارہ تیرہ سو سال قبل بیان کیا تھا اس لئے آپؑ ان تھیوریز کی تکمیل فرماکر تخلیق کائنات کے بارے میں ایسا نظریہ پیش کر سکے جسے آج علمِ فزکس کے ماہرین تسلیم کرتے ہیں اور اس نظریہ کے مقابل میں اس سے بہتر نظریہ پیش نہ کر سکے۔ اس نظریے کا سب سے نمایاں حصہ دو متضاد قطبوں کا موضوع ہے۔امام جعفر صادقؑ سے قبل یونان کے فلاسفہ اور اسکندریہ کے دانشوروں نے تحقیق کی تھی کہ ہستی اور وجود میں اضداد پائے جاتے ہیں اور ان میں سے بعض نے کہا تھا کہ ہر چیز کو اس کی ضد سے پہچاننا چاہیئے۔

لیکن امام جعفر صادقؑ کی تھیوری میں اضداد سے متعلق ایک واضح نظریہ بیان کیا گیا ہے اور یہ وضاحت نہ یونان کے قدیم فلسفیوں کے نظریے میں موجود ہے نہ اسکندریہ کے علمی مکتب کے علماء کے نظریے میں۔ یونان اور اسکندریہ کے دانشوروں نے اضداد کے بارے میں اپنے نظریات کو گریز کی گنجائش کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے نظریہ میں غلطی پر تھے تو فوراً اپنے بیان کو واپس لے سکیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت اس لئے پیدا ہوئی کہ انہیں اپنی بات پر پورا یقین نہیں تھا اور وہ اپنی تھیوری کو معتبر نہیں سمجھتے تھے۔

لیکن امام جعفر صادقؑ نے اپنے نظریے کو بغیر کسی قید و شرط کے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا اور آپ کی تھیوری میں "اگر" اور "لیکن" کا وجود نہیں ہے۔ آپ کے نظریے کی صراحت ثابت کرتی ہے کہ آپ کو اپنی بات پر پورا یقین تھا۔ اور اپنے لئے انحراف کا راستہ کھلا نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ (اس مقام پر مسیحی علماء نے اپنے خیال میں شیعوں کے عقیدے کی رد کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تخلیقِ کائنات ' عناصر ِکیمیا و ریاضیات اور دوسرے علوم کے سلسلے میں امام جعفرصادقؑ کے اقوال ایک مورخ کے نزدیک علمِ لدنی اور علمِ امامت کے تحت نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ نے یقیناً ابتدائی تعلیم کسی استاد سے حاصل کی ہوگی جیسا کہ آپ اپنے والد کی درس گاہ میں بھی مدتوں تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔ لہٰذا ایسا شخص علمِ لدنی کا حامل نہیں ہو سکتا

درحالیکہ ان کی یہ دلیل کوئی وزن نہیں رکھتی کیونکہ اوّل تو آپ کا کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا ثابت نہیں دوسرے اگر آپ نے اپنے والد امام محمد باقر علیہ السلام کی درس گاہ میں ہی یہ سب کچھ سیکھا تھا تو درس گاہ کے دیگر شاگردوں نے بھی جو آپ کے ہم درس تھے یہی انکشافات کیوں پیش نہیں کئے؟ اور تیسرے یہ کہ اس بات کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ آپ نے اپنے والد سے سیکھا شیعوں کا عقیدہ باطل نہیں ہوتا کیونکہ امام محمد باقر علیہ السلام بھی تو امام اور علمِ لدنی کے حامل تھے اور پھر یہ سوال بھی پیدا ہو گا کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے کس سے سیکھا تھا؟ اور نتیجہ یہ ہو گا کہ بالآخر یہ سلسلہ خدا اور رسولؐ تک ہی پہنچ کر ختم ہو گا۔ فہو المطلوب ۔ مترجم اردو) امام جعفر صادقؑ نے پیدائشِ عالم کے سلسلے میں جو باتیں بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک یہی دو متضاد قطبوں کی بات ہے' آپ کے قول کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی جب سترھویں صدی عیسوی کے بعد فزکس میں دو متضاد قطبوں کا وجود ثابت ہوا۔

آپ کے معاصرین اور بعد میں آنے والوں نے دو متضاد قطبوں کو قدما کے ان اقوال میں شامل کیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ آپ کے قول کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی جب فزکس میں دو متضاد قطبوں کا وجود ثابت ہوا اور آج بھی ایٹم شناسی اور الیکٹرونکس (Electronics) میں دو متضاد قطبوں کا وجود ناقابل تردید ہے۔

ہم نے عناصر اور پیدائشِ کائنات کی بحث میں امام جعفر صادقؑ کے علوم کا تذکرہ جغرافیہ' نجوم اور فزکس سے شروع کیا ہے۔ چنانچہ ابھی ہم فزکس کا بیان جاری رکھیں گے اور اس کے بعد دیگر مسائل پر گفتگو کریں گے' فزکس میں امام جعفر صادقؑ نے ایسی چیزیں بیان فرمائی ہیں جنہیں آپ سے پہلے کسی نے نہیں بتایا اور آپ کے بعد بھی اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصے میں انیسویں صدی تک کسی کی عقل میں نہیں آئیں

علمِ فزکس کے سلسلے میں امام جعفر صادقؑ نے جو قوانین بتائے ہیں ان میں سے

ایک اجسام کے شفّاف اور غیر شفّاف ہونے سے متعلق ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ جو جسم جامد اور جاذب ہوتا ہے وہ غیر شفاف اور کثیف ہوتا ہے اور جو جامد اور دافع ہوتا ہے وہ کم وبیش شفاف نظر آتا ہے۔

آپ سے پوچھا گیا کہ جاذب کن معنوں میں فرمایا کہ "جاذبِ حرارت۔"

فزکس کا یہ نظریہ جسے آج ہم جانتے ہیں ایک الحاق کے ساتھ ایسا جاذبِ توجہ علمی قانون ہے کہ انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں ایک انسان کیونکر ایسا نادر اور انوکھا نظریہ پیش کر سکا۔

آج اگر سو آدمیوں سے یہ پوچھا جائے کہ کس وجہ سے ایک جسم کثیف اور دوسرا شفاف نظر آتا ہے تو ایک بھی جواب نہیں دے سکے گا۔ یعنی یہ نہیں بتا سکے گا کہ کس سبب سے لوہا تاریک اور کثیف اور بلور صاف و شفاف ہوتا ہے۔ موجودہ فزکس کا قانون کہتا ہے کہ جس جسم کے اندر سے حرارت کی لہریں سہولت کے ساتھ گزر جاتی ہیں یعنی وہ "الیکٹرو میگناٹک موجیں" (Electromagnetic Waves) جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو وہ جسم تاریک و کثیف ہوتا ہے۔ لیکن وہ جسم جو حرارت کو بخوبی راستہ نہیں دیتا اور "الیکٹرو میگناٹک موجیں" اس میں سے نہیں گزر سکتیں وہ روشن اور شفاف ہوتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے برقی اور مقناطیسی لہروں کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ حرارت کا نام لیا ہے ' پھر بھی جو کچھ فرمایا ہے تھوڑے اضافے کے ساتھ موجودہ فزکس کے قوانین کے مطابق ہے چنانچہ یہ قوانین بتاتے ہیں کہ بعض اجسام (جیسے لوہا وغیرہ) کے کثیف و تاریک ہونے کا سبب یہ ہے کہ الیکٹرو میگناٹک لہریں ان میں جذب ہو جاتی ہیں وہ جاذب اور راستے دینے والے ہیں لیکن جن اجسام میں حرارت جذب نہیں ہوتی اور وہ الیکٹرو میگناٹک لہروں کے گزرنے میں حائل اور مانع ہوتے ہیں کم و بیش شفاف ہوتے ہیں۔

اجسام کی کثافت اور شفافیت کے موضوع پر امام جعفر صادقؑ کا کلّی نظریہ ان کی

جاذبیت پر مبنی ہے چنانچہ جب آپ سے اس کی وضاحت چاہی گئی تو فرمایا کہ جو اجسام حرارت کو جذب کرتے ہیں وہ تاریک ہوتے ہیں اور جو حرارت کو جذب نہیں کرتے وہ کم و بیش شفاف ہوتے ہیں۔

آپؑ کے نظریے میں جاذب ہونے کا مسئلہ بھی دو متضاد قطبوں کے مانند بہت دلچسپ اور لائقِ توجہ ہے اور آپؑ کا یہ بیان اجسام کی کثافت و شفافیت کے متعلق دورِ حاضر کی فزکس کے قوانین کے مطابق ہے۔ اگر آپؑ سے توضیح بھی نہ طلب کی جاتی اور آپؑ یہ نہ بتاتے کہ حرارت جذب کرنے والے اجسام مکدّر و کثیف اور حرارت جذب نہ کرنے والے کم و بیش شفاف ہوتے ہیں تو تب بھی تنہا "جاذب" آپؑ کے مفہوم کو جدید فزکس کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن چونکہ آپ نے حرارت کا ذکر کیا ہے اور برقی اور مقناطیسی لہروں کا حوالہ نہیں دیا ہے لہٰذا آپ کے نظریہ کو جدید فزکس کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اس میں (غیر شفاف اجسام کے بارے میں) برقی اور مقناطیسی لہروں کے جذب کا اضافہ ضروری ہے تاکہ بات مکمل ہو جائے۔

اس کے باوجود امام جعفر صادقؑ کا نظریہ اتنا پر کشش ہے کہ برقی و مقناطیسی لہروں کے جذب کا انکشاف نہ ہونے کے بعد بھی اس کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

جو دماغ بعض اجسام کے کثیف اور بعض کے شفاف ہونے کا سبب دریافت کر لے وہ اپنے ہم عصروں کی عقل و فہم کے مقابل اتنی برتری رکھتا تھا کہ ہم بغیر کسی مبالغے کے کہہ سکتے ہیں کہ وہ علمی حیثیت سے نابغہ اور غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے کا دماغ تھا۔ آپؑ کے ذہنی تراوش نے فقط انہی نظریوں کو پیش نہیں کیا بلکہ علوم میں آپ کے بہت سے نظریات ہیں جنہیں ہم آئندہ پیش کریں گے۔

اس جگہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے بیان کئے ہوئے قانون کی سادگی کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی جائے۔

تجربے نے یہ بات بتائی ہے کہ علمی قوانین جس قدر سادہ اور آسان ہوں گے اسی

قدر مرغوب اور مشہور ہوں گے اور لوگ انہیں فراموش نہیں کریں گے۔ ایک علمی قانون جس قدر سادہ اور آسان ہو گا اسی قدر جلد اور تیزی سے لوگوں کے درمیان مقبولیت اور شہرت پائے گا اور سب سے دیر میں فراموش ہو گا ۔ علمی قوانین کے سادہ ہونے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ان کا رواج صرف ایک قوم یا ایک نسل کے اندر نہیں ہوتا بلکہ یہ تمام قوموں اور نسلوں کے درمیان پھیل جاتے ہیں۔ پندو نصائح' ضرب الامثال اور مختصر اقوال و کلمات کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں سے جو جس قدر سادہ اور آسان ہوتا ہے اسی قدر اس کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لوگ اسے یاد رکھتے ہیں' ہر قوم و نسل اسے اپناتی ہے اور یہ قبولیت اتنی رغبت کے ساتھ ہوتی ہے کہ وہ نصیحت یا ضرب المثل یا مختصر قول اس قوم کی تہذیب و تمدن کا جزو بن جاتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے اس طرح کے بے شمار پندو نصائح' کلمات مرتب فرمائے ہیں جو گزشتہ تمام اقوام میں یہ جانے بغیر کہ کہنے والا کون ہے اور کیا ہے' مقبول و مشہور ہوئے۔

مثلاً آپؑ نے ارشاد فرمایا!

"درد میں مبتلا ہونے کے بعد ہی انسان کو اپنی حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے" یہ قول پہلے تو مدینے میں امام جعفر صادقؑ کی زبان پر جاری ہوا 'اس کے بعد بہت سی ایشیائی' افریقی' یورپی اور پھر امریکی قوموں تک پہنچا اور جہاں بھی جس شخص نے اسے سنا اس بات کا قائل ہوا کہ کہنے والے نے صحیح کہا ہے چنانچہ ساری دنیا میں اس طرح پھیل گیا کہ اس صدی کے مشہور و معروف دانشور اور کینیڈا کی یونیورسٹی کے پروفیسر "مارشل میکلاہن" نے اسے علمِ نفسیات کا ایک قانون قرار دیا اور کہا کہ "صرف درد ہی کا موقع ایسا ہوتا ہے جب ہم اپنی ذات کو فراموش نہیں کر سکتے اور جس وقت ہمارے جسم میں کہیں درد نہیں ہوتا اور کوئی جسمانی یا روحانی تکلیف عارض نہیں ہوتی اس وقت ممکن ہے کہ ہم خود کو بھول جائیں۔"

امام جعفر صادقؑ کے اس قول کے عالمگیر حیثیت حاصل کرنے نیز تمام قوموں اور

نسلوں کی طرف سے قبول کئے جانے کا سبب اس کی سچائی اور سادگی ہے۔

آپ کے اس قول کی عالمگیر شہرت کا سبب اس کی سادگی اور دل نشینی ہے۔ کیونکہ ہر شخص اپنے اوپر اس کی آزمائش کر کے اس کی درستی کا اندازہ کر سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ جس وقت تک وہ کسی جسمانی یا روحانی اذیت میں مبتلا نہیں ہوتا اس وقت ممکن ہے کہ اپنے کو اس طرح سے فراموش کر دے کہ جیسے اسے اپنے زندہ ہونے ہی کی خبر نہ ہو۔ لیکن جب کسی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے تو چاہے جتنی صبر و ضبط کی طاقت رکھتا ہو اپنے کو بھول نہیں سکتا اور وہ درد مستقل طور پر اسے یاد دلاتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔

---☆---☆---

امام جعفر صادقؑ اسلام میں عرفان کے بانی

بعض عرفاء اور مورّخینِ اسلام کا بیان ہے کہ امام جعفر صادقؑ اپنے پدرِ بزرگوار امام محمد باقرؑ کی درس گاہ میں عرفان کی بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

"تذکرۃ الاولیاء" کے لکھنے والے شیخ عطار کا تعلق بھی اسی گروہ سے ہے حالانکہ پہلی صدی ہجری میں عرفان کا کہیں سراغ نہ تھا' اور اگر تھا بھی تو اسے مکتب کی صورت حاصل نہ تھی۔ شاید اس صدی میں عرفانی افکار موجود ہوں اور بعض مفکرینِ اسلام اس کو اپنا موضوعِ سخن بھی بناتے ہوں۔

لیکن پہلی صدی ہجری میں کسی عرفانی درسگاہ کا وجود نہیں تھا جس میں خالصتاً" عرفان کا درس دیا جاتا ہو یا جس میں کوئی پیر' مراد' قطب یا غوث اپنے شاگردوں کو اکٹھا کر کے انہیں عرفان کا سبق دیتا ہو۔ دوسرے یہ کہ عرفان مخصوص انداز کے تجلیٔ افکار کا نام تھا۔ جس کا کلاسیکی درس سے کوئی تعلق نہیں تھا مراد یا قطب اپنے مریدوں کو درس نہیں دیتا تھا وہ ان سے عمل کا خواستگار تھا اور کہتا تھا کہ درس عشق' قلم' دوات اور کاغذ کے استعمال سے حاصل نہیں ہوتا۔

بشوی اوراق اگر ہمدرس مائی\
کہ درسِ عشق در دفتر نبا شد

عرفان دوسری صدی ہجری میں ظہور پذیر ہوا یا یہ کہ اس صدی میں اس نے درسگاہ

کی صورت اختیار کی۔ اس سے پہلے اس عنوان سے کوئی درسگاہ قائم نہیں ہوئی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تذکرۃ الاولیاء ایک شہرت یافتہ کتاب ہے اور بعض فضلا کے نزدیک اس کا شمار عالمِ اسلام کی معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایسی غیر معتبر روایات بھی موجود ہیں جن کی تردید میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں۔ جس میں سے ایک روایت یہ ہے کہ مشہور صوفی بزرگ "بایزید بسطامی" ایک مدت تک امام جعفر صادقؑ کے ساتھ ان کے شاگرد بن کر رہے اور آپؑ سے عرفان کا درس لیتے رہے۔ تذکرۃ الاولیا کے مطابق بایزید بسطامی نے علوم کی تکمیل کے بعد وادیٔ عرفان میں قدم رکھا اور ۳۱۳ عرفاء سے تلمذ حاصل کیا۔ جس میں سے آخری ہستی امام جعفر صادقؑ کی ذاتِ گرامی تھی وہ ہر روز امامِ عالی مقام کی خدمتِ اقدس میں پہنچتے اور آپؑ کی باتوں کو اس توجہ کے ساتھ سنتے کہ لمحہ بھر کے لئے ان کی آنکھیں آپ سے نہ پھرتیں۔ ایک دن امام جعفر صادقؑ نے ان سے کہا بایزید تمہارے سر پر جو طاق ہے اس پر سے فلاں کتاب اتار لاؤ۔ بایزید نے کہا کون سا طاق؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا تم اتنے عرصے سے یہاں آرہے ہو اور تم نے ابھی تک طاق کو نہیں دیکھا! بایزید نے عرض کیا! میں اتنے عرصے صرف آپ کو دیکھتا رہا۔ اس لئے کہ میرے آنے کی غرض آپؑ تھے اور بس!

امام جعفر صادقؑ نے بایزید کے اس کلام کو سن کر فرمایا! آج سے تمہاری تعلیمات کا دور ختم ہوگیا اب میری اجازت ہے کہ تم بسطام واپس جاؤ اور وہاں جاکر خلقِ خدا کے لئے رشد و ارشاد کا ذریعہ بن جاؤ۔ بایزید نے بسطام کا سفر اختیار کیا اور وہاں پہنچ کر رشد و ہدایت میں مشغول ہوگئے۔

غالباً تذکرۃ الاولیاء کے لکھنے والے نے اس روایت کو صحیح سمجھ کر نقل کیا ہے لیکن چونکہ یہ روایت "کرونولوجی" (یعنی وقوع تاریخ کے اعتبار سے واقعات کی تنظیم) کے مطابق نہیں اس لئے قطعی درست نہیں ہے۔ اور اگر تذکرۃ الاولیاء کے لکھنے والے نے اسے ازخود جعل نہیں کیا تو یقیناً کسی اور نے ایسا کیا ہے۔ اور لکھنے والے نے اس پر تحقیق و تفحص سے کام نہیں لیا۔ کیونکہ امام جعفر صادقؑ دوسری صدی ہجری کے نیمۂ

اوّل میں مشغولِ تدریس تھے۔ اور آپ کی سنِ وفات بھی ۱۴۸ ہجری ہے جب کہ بایزید بسطامی کی تاریخِ رحلت میں اختلاف ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تیسری صدی ہجری کے رہنے والے تھے پھر کس طرح وہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں پہنچ سکتے ہیں۔ البتہ امام جعفر صادقؑ کے دروس میں عرفان کی تعلیم سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

امام جعفر صادقؑ کے درس میں عرفان کا وجود آپ کی شخصیت کو اور بھی زیادہ قابلِ توجہ اور دلچسپ بناتا ہے اور اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ آپ کا ذوق اور لگاؤ گوناگوں تجلّیات کا حامل تھا۔

دوسری صدی ہجری سے یعنی جب سے اسلامی دور کا عرفان مشرق میں نمودار ہوا آج تک لوگوں کے نزدیک وہ ایک ایسی شئے ہے جو تخیّل و تصوّر اور ذاتی محویّت سے آگے نہیں بڑھی ہے۔

اگرچہ عارف کے اعمال پر عرفان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اسے خوش خلق، مہربان اور نوع پرور بناتے ہیں لیکن خود عرفان ایک معنوی سلوک ہے جس کا مادی اور تجرباتی علوم سے کوئی تعلق نہیں جب کہ امام جعفر صادقؑ اصولِ تجربہ کے پابند تھے۔ آپ وہ پہلی ہستی ہیں جنھوں نے اسلام میں تھیوری کو عمل سے وابستہ کیا۔ علمِ فزکس اور کیمیا کا کوئی نظریہ آپ کے نزدیک اس وقت تک قابلِ قبول نہیں تھا جب تک کہ آپ خود اس پر عمل کرکے اس کی صحت کو اچھی طرح جانچ نہ لیں۔ آج تجربہ سے سروکار رکھنے والے علمِ فزکس اور کیمیا کے دانشمند عرفان سے بے بہرہ ہیں۔ اس لئے کہ عرفان ایک ایسی شے ہے جسے فزکس اور کیمیا کے تجربوں کے ذریعے نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ یہ وہ کیفیت ہے جو نفس کی تلقین کے زیرِ اثر ایک طویل مدت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

امام جعفر صادقؑ کو جو عالمِ اسلام میں علمِ فزکس اور کیمسٹری کے پہلے حقیقی دانشمند تھے قاعدتاً" عرفان سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے برعکس آپؑ کو عرفان سے اس درجہ تعلق تھا کہ علامہ " زمخشری " نے اپنی کتاب "ربیع الابرار" میں

آپ کے غیر معمولی علمی مقام کے تذکرہ کے بعد آپ کو عرفان کا پیشرو تسلیم کیا ہے۔

تذکرۃ الاولیاء کے مولف "عطار" نے بھی جو ایک مشہور عارف تھے امام جعفر صادقؑ کو عرفان کا پیشرو مانا ہے لیکن تاریخی حیثیت سے " زمخشری " کا قول "عطار" کی تحریر کے مقابلے میں زیادہ وزنی اور وقیع ہے اس لئے کہ "تذکرۃ الاولیاء" کی بعض روایات تاریخ و وقوع کے لحاظ سے غیر مربوط ہیں' خود مولّف بھی جذبے کی حالت میں لکھتے تھے اور چونکہ عرفاء کے عاشق تھے لہٰذا اس طرف متوجہ نہیں تھے کہ ان میں سے کسی کسی کے بارے میں انہوں نے غلو سے کام لیا ہے' کیونکہ اگر متوجہ ہوتے تو غلو سے کام نہ لیتے یہ جانتے ہوئے کہ مبالغہ کلام کی قدر و قیمت کو گھٹا دیتا ہے اور اگر تاریخ میں مبالغہ داخل ہوجائے تو اسے تاریخ نہیں کہا جاسکتا۔ " زمخشری " کا قلم ایک مورّخ کا قلم تھا جب کہ "عطار" کے قلم کو ہم ایک عاشق کا قلم کہہ سکتے ہیں۔ بہرحال بعض مورّخین اور عرفاء اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ دنیائے اسلام کے پہلے عارف یا عالمِ اسلام کے عرفاء سابقین میں سے ہیں کیا امام جعفر صادقؑ کے پہلے عارف یا دنیائے اسلام کے عرفاء سابقین میں ہونے کی رو سے غیر مسلم طالبِ علموں کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ آپ کے درس میں شریک ہوکر آپ کے علم سے استفادہ کریں؟ کیونکہ بعض ماخذ اس بات کی نشاندھی کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کے درس میں صابی مذہب کے پیروکار بھی موجود تھے۔ صابی وہ قوم تھی جس نے یہودیوں اور عیسائیوں کے عقائد کو مخلوط کرکے ایک دین بنا لیا تھا اور جو موحّدین میں شمار ہوتے تھے لیکن ان میں سے بعض مشرک بھی تھے جنہوں نے فروغِ اسلام کے بعد اپنے آپ کو موحّد ظاہر کیا تاکہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرسکیں ہمیں اس بات کا علم ہے کہ مسلمانؑ موحّدین کے فرقوں کو جنہیں وہ اہلِ کتاب کہتے تھے' تکلیف نہیں دیا کرتے تھے۔

صابئین کا مرکزِ سکونت "حران" تھا جو جنوبی بین النہرین کے مغرب میں واقع تھا اور جسے یورپ کی قدیم تاریخوں میں "کارہ" کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ خدائے واحد کی پرستش کرنے والے صابئین کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ نوزائیدہ بچے کی پیدائش کے بعد

اسے پانی سے غسل دیتے اور اس کے لئے کسی نام کا انتخاب کرتے یعنی اس کی تعمید کرتے تھے۔

بعض یورپی محققین جن کا نظریہ "دائرۃ المعارف اسلامی" میں مذکور ہے اس عقیدہ کے مالک ہیں کہ لفظ صابئی صبع (صاد - با - عین) سے ماخوذ ہے جس کا مفہوم پانی میں غوطہ لگانے یا غسل کے ہیں کیونکہ صابئی مذہب کے پیروکار اپنے نومولود بچوں کو تعمید کے وقت پانی میں ڈبویا کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ صرف عین اس لفظ سے گر گیا اور اس لفظ نے موجودہ شکل اختیار کی۔ یورپ کے انہیں محققین نے یہ بھی کہا ہے کہ صابئین' حضرت عیسیٰؑ کو اپنا نبی مانتے تھے جو "معمد" (تعمید دہندہ) کے لقب سے مشہور تھے۔ تذکرۃ الاولیاء کے مصنف نے لکھا ہے کہ تمام فرقے امام جعفر صادقؑ سے کسب فیض کرتے تھے۔

شیخ ابوالحسن خرقانی کا کہنا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ میں مسلمان اور کافر سبھی حاضر ہوتے تھے اور آپ کے خوانِ فضل و کرم سے مستفیض ہوتے تھے۔

ہم نہیں جانتے کہ امام جعفر صادقؑ چونکہ ایک عارف تھے اس لئے اجازت دیتے تھے کہ غیر مسلم طالب علم بھی آپؑ سے کسب فیض کریں' یا چونکہ آپ ایک وسیع اور عمومی نظر کے مالک تھے اور ہر ایک کو علم سے بہرہ مند کرنا چاہتے تھے لہٰذا اس بات کو پسند فرماتے تھے کہ جو بھی علم کا طلبگار ہو وہ آپ کے پاس آکر درس لے سکتا ہے' چاہے وہ مسلمان نہ ہو کم سے کم اتنا تو مسلّم ہے کہ آپ کے شاگردوں میں ایک تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جن کا مسلک صابئی تھا اور بعض یورپی محققین جنھوں نے کتاب "دائرۃ المعارف" میں اپنے نظریے کا اظہار کیا ہے' کہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کے ایک مشہور شاگرد "جابر بن حیان" بھی صابئی مذہب کے حامل تھے۔ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں پہنچنے والے تمام صابئی طالب علم صاحبِ فہم تھے اور تحصیلِ علم میں زحمتیں برداشت کرتے تھے چنانچہ سبھی نے علمی دنیا میں کافی ترقی کی اور امام جعفر صادقؑ کی درسگاہ صائبین کے لئے ایک ایسا دارالعلوم بن گئی جس نے صابی علم و ادب کی بنیاد

رکھی۔ جب ہم امام جعفر صادقؒ سے پہلے کی صابئ تاریخ کا آپؒ کے بعد کی تاریخ سے موازنہ کرتے ہیں تو ظلمت اور نور کا فرق نظر آتا ہے۔

آپ سے قبل صابئ ایک بدوی اور پسماندہ قوم تھی جس کی معلومات اور اطلاعات بدویوں کی حدودِ علم سے زیادہ نہ تھی' یہاں تک کہ ان میں سے جو لوگ موحّد شمار کئے جاتے تھے ان کی اطلاعات بھی صحرانشین قبائل سے زیادہ نہیں تھیں لیکن امام جعفر صادقؒ کے دور کے بعد یہ قوم علمی ادارے کی مالک بن گئی اور اس میں ایسے ممتاز دانشور پیدا ہوئے جنہوں نے علمِ طب' طبیعیات' کیمیا اور ہندسہ میں عالمگیر شہرت حاصل کی اور آج ہم ان کے ناموں کو دائرۃ المعارف میں پڑھتے ہیں۔

یہ امام جعفر صادقؒ کے مدرسے ہی کا فیض تھا کہ پسماندہ صابئ قوم ایک متمدن قوم بن گئی اور اس قوم سے ایسے ایسے ادیب اور دانشمند پیدا ہوئے کہ ان کے آثار سے ساری دنیا نے فائدہ اٹھایا' نیز یہ آپ کا مدرسہ ہی تھا جو صابئین کی قوم کو باقی رکھنے کا ضامن بنا۔ وہ قوم جو اپنے کو نہیں پہچانتی ' اپنی تاریخ سے بے خبر ہوتی ہے وہ قوم مٹ جاتی ہے۔ لیکن جس قوم کے پاس یہ ساری چیزیں موجود ہوتی ہیں وہ ختم نہیں ہوتی' جیسے کہ صابئین ختم نہیں ہوئے اور اب تک موجود ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد پہلے جتنی نہیں ہے لیکن ان کے کچھ لوگ اب بھی اس علاقے میں آباد ہیں جو ان کا قدیم مسکن تھا۔

شیخ ابوالحسن خرقانی بھی زمخشری اور عطار نیشاپوری کے مانند امام جعفر صادقؒ کے بہت معتقد تھے۔ اور آپؒ کو عرفاء اسلام کا پیشوا سمجھتے تھے شیخ ابوالحسن خرقانی کو تاریخ کا ایک محقّق بھی ماننا چاہئے کیونکہ انہوں نے عرفان کی بنیادی تحقیق کی اور اس بات کا اندازہ لگایا کہ عرفان گزشتہ زمانے میں یعنی اسلام سے قبل بھی مشرق میں موجود تھا لیکن وہ قبلِ اسلام ایران میں عرفان کی بنیادوں کا پتہ نہیں لگا سکے کیونکہ انہوں نے زردشتی مذہب پر توجہ نہیں دی۔ جب کہ اس کے لئے اس مسلک کو بھی نظر میں رکھنا ضروری تھا۔

آج ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ ایران میں اسلام سے قبل عرفان کی کئی بنیادیں تھیں جن میں سے دو بنیادیں بڑی اہم تھیں۔ ایک وہ عرفان جو زردشتی مذہب سے رونما ہوا اور دوسرا وہ جو مکتبِ اسکندریہ کے راستے ایران پہنچا۔

شیخ ابوالحسن خرقانی یہ جاننے میں ناکام اور اس مذہب کی طرف سے غافل رہے درحالیکہ چوتھی صدی ہجری کے نیمۂ آخر اور پانچویں صدی کے نیمۂ اول میں جو ان کا دورِ حیات بھی تھا اور ایران کے کئی حصوں میں لوگ پہلوی ساسانی زبان میں گفتگو کرتے تھے لیکن مسلمان تھے اور جو لوگ یہ زبان بولتے تھے ان میں سے ایک جماعت شیخ کی جائے پیدائش کے قریب ہی رہتی ہے چنانچہ یہ بات بعیداز عقل ہے کہ انہوں نے ان لوگوں کو دیکھا نہ ہو یا ان کی زبان نہ سنی ہو۔ انہوں نے یہودی اور مسیحی ادیان کو تو اچھی طرح سے سمجھا تھا لیکن زردشتی مذہب سے ناواقف رہے پھر بھی اسلام سے قبل عرفان پر ان کی تحقیق دلچسپی سے خالی نہیں۔

سترہویں صدی عیسوی سے آج تک فرانسیسی علمائے مستشرقین کی وسیع تحقیقات اور ہندوستان کی قدیم کتابوں کے ترجمے جن میں سب سے ممتاز وید کی کتابیں ہیں یہ ثابت کرتے ہیں کہ قدیم زمانوں میں ایران اور ہندوستان کے درمیان ایک وسیع فکری اور ادبی رابطہ موجود تھا اور ان دونوں ملکوں کا علم و ادب انہیں روابط کے تحت قائم ہوا' سترھویں صدی عیسوی کے بعد سے یورپی مستشرقین یہ جانتے تھے کہ زردشتی مذہب نے ہندوستانی خیالات سے بھی اکتساب کیا ہے اور بلاشبہ زردشتی عرفان بڑی حد تک ہندی افکار سے متاثر ہوا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ زردشتی عرفان نے کافی حد تک ہندی افکار کو قبول کیا ہے تاہم زردشتی مذہب' ہندی مذہب سے مختلف ہے اور زردشتی مذہب کی ثنویت (یعنی دو خداؤں کا عقیدہ) ہندی مذہب کی تثلیث (یعنی تین خداؤں کا عقیدہ) سے فرق رکھتی ہے۔ یورپ والے سمجھتے ہیں کہ زردشتی دو خداؤں کے قائل ہیں۔ حالانکہ وہ موحّد ہیں' اہریمن سے ان کا خوف اور پرہیز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ دوسرے خدا کے قائل ہیں بالکل اسی طرح جس طرح مسلمان

شیطان کو دوسرا خدا نہ سمجھتے ہوئے اس سے پرہیز کرتے ہیں۔(۱)

زر دشت جو بھی ہوں اور ان کا تعلق کہیں سے بھی ہو انہوں نے ہندی عقائد و افکار کا ادراک کرنے کے بعد ہندیوں کی تثلیث سے اجتناب کیا اور اپنے مذہب کی بنیاد ثنویت پر قائم کی اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ دنیا کی بنیاد اضداد پر رکھی گئی ہے اور ہر چیز دو مثبت اور منفی قطبوں کی حامل ہے۔(۲)

اگر شیخ ابوالحسن خرقانی قبل از اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے زر دشتی عرفان اور مکتب اسکندریہ کے عرفان کے مابین فرق قائم کرسکتے تو سمجھ لیتے کہ زر دشتی عرفان ثنویت کا حامل ہے لیکن جس عرفان کے موجد امام جعفر صادقؑ ہیں وہ ایک توحیدی مسلک ہے۔ جس میں دو کا تصور بھی نہیں پایا جاتا تین کا تصور تو بدرجہ اولیٰ نہیں اور یہ بلامبالغہ انسانی روح کے تزکیہ اور ارتقاء کے لئے بلند ترین زاویہ فکر ہے اور اس قدر بلند کہ نہ امام جعفر صادقؑ کے عہد میں معمولی افراد نے اس پر دسترس پائی نہ بعد کے زمانوں میں جب کہ عرفان کے متعدد مکاتب قائم ہو چکے تھے۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ کا عرفان عام اشخاص کی رسائی سے ایک بالاتر چیز تھی اور ہے کیونکہ نہ یہ ہندی اور مسیحی تثلیث ہے نہ زر دشتی ثنویت اور نہ بعض بعد میں آنے والے عرفاء کی مبالغہ آرائی۔

بعد کے ادوار میں قائم ہونے والے بعض عرفانی مکاتیب کے بانیوں نے عرفانی افکار و خیالات میں اتنے غلو اور اس قدر مبالغے سے کام لیا کہ کفر کی حد تک پہنچ گئے اور دیکھا گیا کہ ان کے مبالغہ کی وجہ سے ان کے بعض پیروکار بھی ان سے برگشتہ ہو گئے' ان

۱۔ مترجم

۲۔ جب سے ایٹم کی اندرونی کیفیت کی شناخت کی گئی ہے مسیحی اور ہندی اقوام نے سوچا ہے کہ اپنے عقیدہ تثلیث کی تائید کے لئے سائنسی قرینہ سے بھی استفادہ کریں۔ کیونکہ ایٹم بھی تین اجزاء یعنی پروٹون' الیکٹران ' نیوٹرون پر مشتمل ہے لیکن مترجم نے کئی سال قبل ایک امریکی رسالے "علم " میں پڑھا کہ ایٹم میں ان اجزاء کے علاوہ اور بھی چیزیں شامل ہیں اور (مضمون نگار کے مطابق) اس وقت تک ایٹم میں پچاس چیزوں کا انکشاف ہوا ہے۔

میں سے بعض افراد کی عرفانی زندگی میں شطح اور طامہ (صوفیت کی اصطلاحیں) اس حد تک پہنچا کہ انہوں نے اپنے کو خدا کے برابر سمجھ لیا۔ اور ایسا بے سبب نہیں تھا کہ زمخشری جیسے مشہور عالم ان لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔

البتہ امام جعفر صادقؑ کا عرفان چونکہ مبالغے سے پاک تھا لہٰذا نہ صرف شیعہ مذہب کے عارفین نے اس کی پیروی کی بلکہ اہلسنّت عرفاء کی ایک جماعت نے بھی آپؑ سے اس کا درس لیا ہے۔ اور آپؑ کے دو سو سال بعد خلفائے بنی عباس کے مرکز بغداد میں سنّی عارف آپؑ کے عرفان کی پیروی کرتے تھے۔ حالانکہ اسلام میں عرفان کے بانی کو انہیں عباسی خلفاء میں سے ایک خلیفہ نے قتل کیا تھا۔

امام جعفر صادقؑ کا عرفان ذاتِ خداوندی پر توکّل اور اس کے احکام کو اس طرح بجا لاتا ہے کہ دنیاوی امور سے غفلت نہ برتی جائے جس سے زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے۔

عطار نیشاپوری تذکرۃ الاولیاء میں لکھتے ہیں کہ بایزید بسطامی نے بزرگ عارفین کی خدمت میں پہنچنے کے لئے تیس سال تک بیابانوں کی خاک چھانی ہے اور بھوک و پیاس کی مصیبت جھیلی، یہاں تک کہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں پہنچے' اس چیز کی طرف متوجہ نہیں تھے کہ امام جعفر صادقؑ یہ نہیں چاہتے تھے کہ بایزید بسطامی مکمل طور پر دنیاوی زندگی سے لاتعلق ہو جائیں اور تیس سال تک بھوک و پیاس کی زحمت اٹھائیں' لہٰذا اگر امام جعفر صادقؑ کے حضور بسطامی کے پہنچنے والی روایت صحیح ہوتی تو بانیٔ عرفان امام صادقؑ ضرور انہیں تنبیہہ اور ملامت کرتے اور فرماتے کہ تم نے کس لیے تیس سال جنگلوں اور بیابانوں میں بسر کئے اور کیوں اپنے اہل و عیال کے حق میں اپنی ذمّہ داری پوری نہ کی؟ اس لئے کہ امام جعفر صادقؑ کا عرفان ترکِ دنیا کا حامی نہیں ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ ہر شخص کو امورِ آخرت کے ساتھ ساتھ اپنے دنیاوی معاملات بھی درست رکھنا چاہیے۔ امام جعفر صادقؑ کے عرفان میں آپؑ کے بعد آنے والے متعدّد عرفانی مکاتیب کی طرح خدا تک پہنچنے کا مسئلہ موجود نہ تھا۔

آپؑ یہ نہیں کہتے کہ انسان خدا تک پہنچ جائے گا مگر ان حدود میں جو قرآن نے بتائے ہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان خدا کے لئے ہے اور اسی کی طرف پلٹ کر جائے گا لیکن اس قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خدا ہو جائے گا۔ انسان جو مخلوق ہے ہمیشہ مخلوق ہی رہے گا اور یہ ہرگز خدا نہیں ہو سکتا' البتہ مرنے کے بعد چونکہ خدا کی طرف پلٹ جائے گا لہٰذا اس سے نزدیک تر ہو جائے گا۔ امام جعفر صادقؑ کے بعد دوسرے عرفانی مکاتب نے انا للہ و انا الیہ راجعون سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب انسان مرنے کے بعد خدا سے ملحق ہو جاتا ہے اور خدا ہو جاتا ہے تو اپنی زندگی میں کیوں خدا نہیں ہو سکتا؟ مرنے کے بعد خدا ہونے کے عقیدے سے یہ نظریہ پیدا ہوا کہ مرنے کے بعد جب انسان خدا سے پیوست ہو جاتا ہے تو پھر وہ زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔ وہ ہر چیز سے آگاہ ہوتا ہے اس دنیا کے حالات کا بخوبی مشاہدہ کرتا ہے۔ اپنے اعزّہ و اقربا کو دیکھتا ہے اور ان کی مشکلات کو حل کرتا ہے۔ مرنے کے بعد زندہ رہنے کا عقیدہ صرف مسلمانوں ہی کا عقیدہ نہیں ہے بلکہ تمام قدیم ادیان میں پایا جاتا ہے۔ ہمیں پچھلے ادیان میں صرف دو کے علاوہ اور کوئی ایسا دین نہیں ملتا جس میں انسان کے مرنے کے بعد زندہ رہنے کا عقیدہ موجود نہ ہو یہاں تک کہ جن مذاہب کے پیرو مردے کو جلا کر اس کی خاک دریا میں بہا دیتے ہیں وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ مردہ دوسری دنیا میں زندہ ہے صرف مانوی مسلک کے لوگ اور باطنی فرقے کے پیرو جو اسماعیلی مذہب سے تعلق رکھتے تھے یہ کہتے تھے کہ انسان مرنے کے بعد بالکل فنا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں فرقے قیامت پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ البتہ حسن صباح کے بعد باطنی مذہب کے داعی اس بات کی طرف متوجہ ہوئے کہ ان کے پیروؤں کو معاد' حیات بعد الموت اور پاداشِ عمل یا دوسری دنیا میں سزا و جزا ملنے پر عقیدہ رکھنا چاہیے۔ یہاں تک کہ ایک باطنی اور وجدانی نگران بھی ہر شخص کے ساتھ رہے تاکہ اسے برے افعال سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ ان دونوں فرقوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو سارے ادیان میں کسی نہ کسی طرح معاد کو تسلیم کیا گیا ہے تاکہ ایک وجدانی اور باطنی نگراں موجود رہے۔

ان میں سے بعض کے اندر مثلاً قدیم مصر میں پاداش اور سزا و جزا کے لئے جسمانی موت کے بعد فوراً بلا فاصلہ دوسری زندگی شروع ہو جاتی تھی اور بعض دوسروں کے نزدیک اس دنیا کی موت اور دوسری دنیا میں جزا و کیفرِ کردار کے درمیان میں کچھ وقفہ یا فاصلہ پایا جاتا ہے یہاں تک کہ وحشی قبائل میں بھی حیات بعد الموت کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ اور یہ لوگ بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ انسان مرنے کے بعد پھر زندہ نہ ہو گا۔ دریائے نیل کے سرچشموں کا انکشاف کرنے والا "ڈاکٹر لیونگ اسٹون" جس نے انیسویں صدی عیسوی میں اپنا سفر نامہ اور انکشافات کی تفصیل حکومتِ انگلستان کی شاہی انجمن جغرافیہ (Royal Society of Geography) کے سامنے پیش کی تھی، مرکزی افریقہ میں اپنی طولانی سکونت کے دوران ہر قبیلے کے ساتھ رہا اس نے غور کیا کہ ہر قبیلہ اپنے مرے ہوئے اجداد کی زندگی پر ایمان رکھتا ہے۔ ان میں سے بعض قبائل اپنے اجداد کے ارادے اور نظریئے کو اپنی زندگی کے امور میں مؤثر جانتے ہیں۔ افریقی قبائل کے بعض جادوگر اپنے اجداد کے ارادے اور نظریات کو اپنی قوم کے لئے تعین کرتے ہیں۔

لیونگ اسٹون نے مرکزی افریقہ میں جو دیکھا اور سنا نیز دیگر اشخاص نے مختلف علاقوں میں جو کچھ مشاہدہ کیا اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تمدن کے لحاظ سے جو قبیلہ جس قدر پس ماندہ ہوا ہے اسی قدر اس کے اندر حیات بعد از موت کا اعتقاد زیادہ قوی ہے۔ لیکن یہ مطلب نہیں کہ متمدن اقوام حیات بعد الموت کے معتقد نہیں آج امریکہ اور فرانس کے لوگ بھی حیات بعد الموت کے قائل ہیں۔ لیکن ان کا عقیدہ افریقہ کے سیاہ فام قبائل کے عقیدے سے مختلف ہے سیاہ فام قبائل کے عقیدہ میں حیات بعد الموت اس کی دنیاوی زندگی کے عین مشابہ ہے جب کہ ایک امریکی یا فرانسیسی یہ نہیں کہتا کہ مرنے کے بعد وہ دوسری دنیا میں اسی طرح کھانا کھائے گا لباس پہنے گا اور فلم دیکھنے سینما ہال جائے گا۔ اسی لئے بعض مفکرین کا کہنا ہے کہ حیات بعد الموت کا عقیدہ بشر کے لئے ایک فطری عقیدہ ہے اگرچہ اس میں حیاتیات یا اعضاء و جوارح کے نظام

عمل کا اصول کار فرما نہیں' جو بھوک وپیاس کی طرح ناقابلِ اجتناب ہو پھر بھی چونکہ یہ عقیدہ جیسا کہ آثارِ قدیمہ کی رو سے سمجھ میں آتا ہے قدیم ترین دور میں بھی موجود تھا اور ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں سال سے اسلاف سے اخلاف کی طرف منتقل ہوتا رہا ہے لہٰذا اس طرح سے جڑ پکڑ چکا ہے کہ انسان کی فطرت کا جزو بن گیا ہے اور صرف وہی شخص اس عقیدہ کا منکر ہو سکتا ہے جس نے ہرگز کسی معاشرے کی صورت نہ دیکھی ہو۔ قوم کے افکار و عقائد اس کے کانوں تک نہ پہنچے ہوں۔

عقیدۂ معاد رکھنے والے تمام مذاہب میں معاد کی بنیاد حیات بعد الموت کے اسی فطری عقیدہ پر قائم ہے۔ عقیدۂ معاد رکھنے والے ہر مذہب نے حیات بعد الموت کے اس فطری عقیدہ سے لوگوں میں باطنی اور وجدانی نگراں کی تقرری کے لئے ایک خاص انداز میں استفادہ کیا ہے۔قدیم مصر میں اگر کوئی چوری کرتا تھا علاوہ اس کے کہ اسے دنیا میں جاری قوانین کے مطابق سزا ملتی دنیائے مغرب یعنی دوسری دنیا میں بھی وہ ہمیشہ تاریکی میں رہتا اور سورج کی روشنی سے بھی محروم کر دیا جاتا اور نہ وہ کسی چراغ ہی سے استفادہ کر سکتا تھا۔(۱)

زردشتی عقیدہ کے مطابق موت کے بعد دنیا میں آدمی کو "چنوند" کے پل سے گزرنا ہو گا۔ اگر اس دنیا میں اس نے خلافِ قانونِ الٰہی عمل کیا ہو گا تو وہ اس پل کو پار نہیں کر سکے گا اور گر کر واصلِ جہنم ہو گا۔

مشرق کے عرفانی مکاتب نے مسلمانوں کے حیات بعد الموت کے فطری اور مذہبی عقیدے سے اثر قبول کیا اور انہوں نے اپنے پیروؤں کی روحانی تربیت کے لئے ایک مناسب میدان یا ہموار راستہ پالیا۔ انہیں اس کی ضرورت نہیں ہوئی کہ اس روحانی تربیت کے لئے مقدمات کا درس شروع کریں اور ایک مدت تک محنت کر کے اپنے

۱۔ قدیم مصر میں (آج کی طرح) تمام شہر دریائے نیل کے کنارے آباد تھے اور تمام قبرستان دریا کے مغربی حصے میں واقع تھے۔ اسی لئے موت کے بعد کی دنیا کو "دنیائے مغرب" کہا جاتا تھا۔

مریدوں کو یہ سمجھائیں کہ آدمی مرنے کے بعد زندہ رہتا ہے۔ لہٰذا انہیں کوشش کرنا چاہئے کہ دوسری زندگی میں بلند ترین مرتبہ حاصل ہو۔ یہ کام عرفان کا پہلا زینہ تھا لیکن عارفین نے دوسری ہجری کے آخر سے اس منزل سے بلند ہو کر عرفان کی بنیاد اس چیز پر رکھی کہ آدمی اس دنیا میں بالا ترین مرتبے تک پہنچ جاتا ہے اور جس چیز نے اس خیال کو جنم دیا یہی حیات بعد الموت کا عقیدہ تھا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر مسلمان یا دیگر قومیں حیات بعد الموت کی قائل نہ ہوتیں تو عرفان وجود ہی میں نہ آتا کیونکہ اس کی کوئی بنیاد نہ ہوتی۔ عرفاء کہتے ہیں کہ آدمی بلا شبہ مرنے کے بعد زندہ رہتا ہے اور موت تبدیلیٔ لباس کے سوا کچھ نہیں لہٰذا انسان دنیا میں روحانی ارتقاء کے بلند ترین مرتبے تک کیوں نہ پہنچے؟ اپنے کو ملکوت تک پہنچائے اور صبر کرے یہاں تک کہ مرنے کے بعد ترقی کی آخری منزل پر فائز ہو جائے؟ متعدّد عرفانی مکاتب کا مقصد یہ تھا کہ انسان اسی دنیاوی زندگی میں اپنے کو ملکوت تک پہنچا دے اور جب ہم اس کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عرفان کا مقصد یہ ہے کہ انسان اسی دنیا میں اور مرنے سے پہلے ہی اپنے کو خدائی درجے تک پہنچا دے لیکن امام جعفر صادقؑ کے عرفان کا موضوع یہ نہیں ہے اور آپؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ انسان اسی دنیاوی زندگی میں اپنے آپ کو مرحلۂ خدائی تک پہنچا دے۔ یہ عقیدہ امام جعفر صادقؑ کے بعد آنے والے عرفانی مکاتیب کی ایجاد ہے اور دو چیزوں نے اس عقیدہ کو عرفانی مکاتب میں جگہ دی۔ ایک حیات بعد الموت کا تصور اور دوسرے وحدتِ وجود۔ وحدتِ وجود کا نظریہ جو امام جعفر صادقؑ کے بعد مشرق میں عرفانی مکاتب کا دوسرا عظیم ستون بنا بلاشبہ مشرق سے نکلا ہے اور اس کا سرچشمہ ہندوستان و ایران میں ہے۔ پھر یہ یورپ تک پہنچا اور وہاں اپنے طرف دار پیدا کئے۔ امام جعفر صادقؑ وحدتِ وجود کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور مخلوق کو خالق سے الگ سمجھتے تھے۔ جو لوگ وحدتِ وجود کے حامی تھے وہ کہتے تھے کہ خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی تفاوت نہیں علاوہ ایک جہت کے یعنی شکل اور لباس کے لحاظ سے اور جمادات و نباتات اور حیوانوں میں سے جو بھی ہے

وہی خدا ہے کیونکہ آغاز میں خدا کے سوا اور کچھ نہ تھا اور چونکہ دنیا کا آغاز و انجام نہیں لہٰذا اب بھی خدا کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور چونکہ خدا کے سوا کوئی تھا اور نہ ہے اس لئے خداوندِ عالم نے ناگزیر طور پر جمادات ' نباتات اور حیوانات کے تخلیقی عناصر کو اپنے اندر سے نکالا ہے لہٰذا خدا اور اس کی خلقت کے درمیان ماہیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

---☆---☆---

امام جعفر صادقؑ نے شیعی ثقافت کی تشکیل کی

جب کوئی انسان روحانی کرب میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وقت وہ اپنی ہستی کو فراموش نہیں کر سکتا اور وہ روحانی کرب اسے مستقل طور پر متوجہ کرتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔

اجسام کے شفاف اور غیر شفاف ہونے کے بارے میں امام جعفر صادقؑ نے جو قانون دریافت کیا وہ بھی اتنا سہل و آسان تھا کہ سب ہی نے اسے قبول کیا اور چونکہ اسے یاد رکھنے میں کوئی دشواری نہیں تھی اس لئے وہ بہت جلد ہی افریقہ اور ایشیاء کی مسلمان قوموں کے درمیان مشہور ہوا۔

آپؑ نے مذہبِ شیعہ کی دو طریقوں سے خدمت کی۔

ایک تو یہ کہ آپؑ نے علوم کی تدریس کے ذریعہ اہلِ تشیع کو دانشمند بنایا۔ جس کے سبب ایک شیعی ثقافت وجود میں آئی۔ شیعی ثقافت کے وجود میں آنے سے اس مذہب کو بڑی تقویت حاصل ہوئی اور ہمارے خیال میں یہ بات واضح و روشن ہے کہ ہر قوم اور ہر طبقہ کے افراد کے لئے ان کی ثقافت' ان کی تقویت کا باعث ہوتی ہے۔ (یونان کی طرح) بعض قدیم قومیں آج بھی اس لئے باقی ہیں کہ وہ ایک پسندیدہ ثقافت کی حامل ہیں وگرنہ آج وہ بھی آہستہ آہستہ صفحہ ہستی سے مٹ جاتیں اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا۔

امام جعفر صادقؑ سے قبل شیعہ حضرات دو صاحبِ علم اماموں کے وجود سے فیضیاب ہوئے جن میں سے ایک ہستی آپؑ کے والدِ بزرگوار امام محمد باقرؑ کی تھی۔

لیکن شیعی ثقافت کے لئے آپؑ میں سے کسی نے کوئی بنیاد قائم نہیں کی اور اس کی اہمیت پر توجہ نہیں دی اس کے علاوہ علمی اعتبار سے بھی ان ہستیوں کا امام جعفر صادقؑ سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

امام جعفر صادقؑ نے محسوس کیا کہ مذہبِ شیعہ کے لئے ایک معنوی اساس کی ضرورت ہے تاکہ آئندہ ادوار میں کسی کے آنے اور کسی کے جانے سے اس مذہب پر کوئی آنچ نہ آسکے۔ آپؑ تدریس کے شروع دن ہی سے اپنا لائحہ عمل جانتے تھے۔

شیعی عقائد کی تشکیل کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جو تدریجی طور پر آپؑ کے ذہن میں آیا ہو۔آپؑ اچھی طرح جانتے تھے کہ شیعہ مذہب کو باقی رکھنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے کہ اس کے لئے ایک ثقافت تشکیل پائے۔

یہ بات واضح کرتی ہے کہ یہ شخصیت نہ صرف علمی لحاظ سے فہم و فراست کی حامل تھی بلکہ آپؑ کو سیاسی تدبر بھی حاصل تھا۔ اور آپ جانتے تھے کہ مذہبِ شیعہ کی تقویت کے لئے کسی ثقافت کی تشکیل طاقت ور فوج تیار کرنے سے بہتر ہے۔ کیونکہ ایک طاقت ور فوج ممکن ہے اپنے سے زیادہ طاقتور فوج کے ہاتھوں مغلوب ہو جائے مگر ایک مضبوط، محکم اور وسیع ثقافت ہرگز تباہی کا شکار نہیں ہو سکتی۔

آپ نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ اس ثقافت کو جلد از جلد وجود میں آجانا چاہئے تاکہ وہ ان تمام فرقوں پر فوقیت رکھے جو اسلام میں ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ اور ابھی ثقافت سے ان کا دور کا رشتہ بھی نہ تھا۔

جس وقت امام جعفر صادقؑ نے ارادہ فرمایا کہ شیعہ مذہب کے لئے ایک ثقافت کی تشکیل کریں اس وقت کسی فرقہ کے بانی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ ان کے لئے ایک ثقافت کی تشکیل ضروری ہے آپؑ نے یہ بات محسوس کی کہ ایک خاص ثقافت کی تشکیل کے بغیر مذہبِ شیعہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اور اس کو باقی رکھنے کے لئے

شیعی ثقافت کا اثر و نفوذ ضروری ہے۔ اور بعد کے واقعات نے بتایا کہ امام جعفر صادقؑ کا نظریہ درست تھا۔ کیونکہ بارہویں امامؑ کے بعد اہلِ تشیع کے پاس کوئی ایسا مرکز نہیں تھا جس کے گرد وہ جمع ہو جاتے اور باوجود اس کے کہ کلیسا کی طرح وسیع ساز و سامان کے ساتھ ان کا کوئی دائمی روحانی مرکز نہیں تھا اور آج بھی امام جعفر صادقؑ سے ساڑھے بارہ سو سال گزرنے کے بعد جب کہ چرچ کی طرح ان کے پاس کوئی وسیع روحانی مرکز موجود نہیں ہے، مذہبِ شیعہ باقی ہے اور برابر پروان چڑھ رہا ہے۔ اور یہ اسی ثقافت کا فیضان ہے جسے امام جعفر صادقؑ نے رائج کیا اور آثار ظاہر کرتے ہیں کہ یہ اس کے بعد بھی باقی رہے گا۔

ظاہر ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے بعد آنے والے شیعہ دانش مندوں نے اس ثقافت کو آگے بڑھایا لیکن آپؑ نے نہ صرف یہ کہ اس کی بنیاد استوار کی بلکہ اس کی شیرازہ بندی بھی آپؑ ہی کے ہاتھوں انجام پائی۔

امام جعفر صادقؑ نے شیعی ثقافت کو رائج کر کے شیعہ علماء کو اس کی ضرورت کا احساس دلایا اور انہیں سمجھایا کہ جو چیز اس مذہب کی بقا کی ضامن ہے وہ اس کی ثقافت ہے لہٰذا ہر دانش مند پر لازم ہے کہ وہ اس کی توسیع کرے اور اگر وہ اس کو آگے نہیں بڑھا سکتا تو اسے چاہئے کہ وہ دوسروں سے پہنچی ہوئی باتوں ہی کی حفاظت کرے اور انہیں لوگوں میں ترویج دے۔

ممکن ہے کہا جائے کہ یہ اہتمام فقط شیعہ مذہب سے اختصاص نہیں رکھتا بلکہ دوسرے مذہب والے بھی یہی اہتمام رکھتے ہیں۔ ہم ان کے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ دوسرے مذاہب میں مذہبی پیشواؤں کا اہتمام فقط مذہبی طور طریقوں کی حفاظت تک محدود ہوتا ہے نہ کہ اس کی توسیع و ترویج۔

یونان کے کوہِ ایتھس پر واقع پندرہ سو سالہ قدیم آرتھوڈکس چرچ میں آج بھی وہی اندازِ سخن ہے جو پندرہ سو سال قبل ہوا کرتا تھا۔ لیکن شیعی ثقافت مجموعی طور پر ہمیشہ آگے بڑھتی رہی اگرچہ بعض ادوار میں اسے کہیں رکنا پڑا لیکن اس رکاوٹ کے دور

ہونے کے بعد اس نے پہلے سے زیادہ سرعت کے ساتھ ترقی کی اور گہری نظر رکھنے والے شیعہ علماء کی یہی کوشش رہی کہ وہ اس ثقافت کو اور بلندی عطا کریں۔

اگر ہم دوسری صدی عیسوی کو انطاکیہ کے آرتھوڈکس چرچ کی رونق کا دور جانیں تو اس مذہب کو جسے عیسائیوں کا سچا مذہب سمجھا جاتا ہے تقریباً اٹھارہ سو سال کا عرصہ گزرتا ہے اور ان اٹھارہ صدیوں میں اس مکتبِ فکر نے کوئی ترقی نہیں کی۔ آج اس کا علمی سرمایہ بس اتنا ہی ہے جتنا اٹھارہ سو سال قبل انطاکیہ میں تھا۔

اگرچہ کئی بار آرتھوڈکس کی عالمی کونسل کا انعقاد ہوا اور اس مذہب کے بڑے بڑے پادری اطراف و اکنافِ عالم سے ایک جگہ جمع ہوئے لیکن ان مشاورتی مجالس میں کوئی نیا قانون وضع نہیں ہوا اور ان کی ثقافت کو کوئی بلندی حاصل نہ ہو سکی۔

فرانس کے مشہور و معروف محقق، ادیب اور مورخ "ڈانیل روپز" کا کہنا ہے کہ کیتھولک ثقافت ایک ہزار سال تک جامد رہی اور اس نے کسی قسم کی ارتقائی منازل طے نہ کیں۔ اس عرصے میں کیتھولک علماء کا کام فقط اپنی سنّت اور رائج طور طریقوں کی حفاظت تھا۔

اس مورّخ کا کہنا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی تک کیتھولک عقائد جمود کا شکار رہے اور اس مکتبِ فکر کے حامل افراد سولہویں صدی عیسوی میں وہی کچھ کہتے رہے جو وہ چھٹی صدی عیسوی میں کہا کرتے تھے۔ اس ہزار سال کے عرصے میں بہت سے زاہد و متقی مرد اور عورتوں نے دنیا میں قدم رکھا جن کا نام آج بھی ہر مذہبی تاریخ میں درج ہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی یہ کوشش نہیں کی کہ اپنی ثقافت کو ترقی کی راہ پر گامزن کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دورِ جدید نے نہ صرف یہ کہ یورپ میں علم و ہنر کو رونق بخشی بلکہ اس نے کیتھولک عقائد کی توسیع بھی کی اور ایسی نمایاں شخصیات کو جنم دیا جنہوں نے اپنی ثقافت کو پروان چڑھایا۔

کیتھولک ثقافت کو آگے بڑھانے والے تمام کے تمام مذہبی رہنما نہ تھے بلکہ ان میں غیرمذہبی افراد کا دخل زیادہ رہا ہے۔

یہی ڈانیل روپز، جس کا تذکرہ ابھی ہم کر چکے ہیں، کوئی مذہبی آدمی نہ تھا لیکن اس کے باوجود اس نے تاریخِ مسیحیت پر جو کتابیں لکھی ہیں اور کیتھولک عقائد کو جو ترقی دی ہے وہ اس قدر مقبول ہے کہ فرانس، اسپین اور اٹلی جیسے کیتھولک مذہب کے حامل ممالک میں آج کوئی گھر ایسا نہیں ہے جس میں ڈانیل روپز کی کم سے کم ایک کتاب اصل یا ترجمہ کی صورت میں موجود نہ ہو۔

انیسویں صدی عیسوی کا مشہور و معروف فرانسیسی فلسفی " ارنسٹ زمان" جس کی "مسیح" نامی کتاب کیتھولک دنیا کی سب سے عظیم یادگار ہے، مذہبی پیشوا نہیں تھا بلکہ فلسفی ہونے کی حیثیت سے کیتھولک چرچ کے پادری اس سے زیادہ خوش نہ تھے تاہم اس نے کتاب کے ذریعے کیتھولک مذہب کی بڑے مؤثر انداز میں خدمت کی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آرتھوڈکس اور کیتھولک دونوں مذاہب کے پاس اپنے اپنے چرچ تھے۔ لیکن آج آرتھوڈکس گرجوں پر بیکسی کا عالم طاری ہے۔ جب کہ کیتھولک چرچ دنیا کے ثروت مند ترین اداروں میں شمار ہوتے ہیں۔ روم میں واقع کیتھولک چرچ کی دولت کا اندازہ ایک لاکھ ملین ڈالر کیا گیا ہے۔ دنیا کا کوئی بینک یا اقتصادی ادارہ اتنی دولت کا حامل نہیں۔

پہلے بھی کیتھولک چرچ جن کا مرکزی مقام روم تھا، وافر سرمایہ کے حامل تھے اور وہ اس سرمایہ کے ذریعہ اپنی ثقافت کو آگے بڑھا سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور ہزار سال کی مدت میں ایک گام بھی آگے نہ بڑھے۔

لیکن اہلِ تشیع کے پاس کوئی مرکزی دینی و مذہبی انجمن یا ادارہ موجود نہیں تھا اس کے علاوہ ان کے علماء کے پاس اتنا سرمایہ بھی نہ تھا کہ وہ اپنے مکتبِ فکر کو عروج دے سکیں تاہم انہوں نے جنگ اور تبدیلیٔ سلطنت (کے ہنگامی حالات) کے علاوہ باقی تمام ادوار میں ترقی کی اور اپنی ثقافت کو آگے بڑھایا۔

ان سب باتوں سے ہماری مراد اس حقیقت کو آشکار کرنا ہے کہ تمام مذاہب کے علماء مذہبی ثقافت کو ترقی دینے میں کوئی اقدام نہیں کرتے تھے۔ اور آج بیسویں صدی

میں وہ اس پر توجہ دے رہے ہیں۔ اگرچہ آرتھوڈکس اور کیتھولک دونوں مذاہب کے لوگ گزشتہ ادوار میں اس فکر سے آزاد تھے۔ اور فقط اپنی سنّت کی حفاظت کو اپنا نصب العین جانتے تھے۔ یہ لوگ بدعت کے خوف سے اپنی ثقافت کی توسیع سے اجتناب کرتے تھے۔

لیکن مذہبی ثقافت کی توسیع بدعت نہیں ہے جیسا کہ پندرھویں صدی عیسوی سے آج تک کیتھولک ثقافت میں جو توسیع ہوئی ہے اس میں بدعت کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔

ایک ہزار سال تک ثقافت کی توسیع سے اجتناب کیتھولک پیشواؤں کی فطرت بن گئی تھی۔ اور وہ آرتھوڈکس پیشواؤں کی طرح اپنی فطرت کو نہیں بدل سکتے تھے۔

پندرھویں صدی عیسوی کے بعد کیتھولک ثقافت میں جو "دورِ تجدّد" وجود میں آیا اس کا آغاز امام جعفر صادقؑ نے اہلِ تشیع کے لئے ساتویں صدی عیسوی ہی میں کر دیا تھا۔ آپؑ نے شیعہ مفکرین اور علماء کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ حسبِ استعداد شیعی ثقافت کی توسیع میں کوشاں رہے کیونکہ یہی وہ عمل ہے جو شیعی مکتبِ فکر کی بقاء کا ضامن ہے۔

امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں اہلِ تشیع کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ زبردستی صاحبِ قدرت بنیں۔

عربستان اور اس کے باہر کے علاقوں میں مذہبِ جعفری کے پیروکار بہت محدود سوسائٹی کے حامل تھے۔ اور ان میں سے بعض سوسائٹیاں تو صرف اپنے خاندان ہی کے چند افراد پر منحصر تھیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر وہ یہ قدرت نہیں رکھتے تھے کہ امّوی حکام پر غالب آ سکیں۔ امام جعفر صادقؑ دیکھ رہے تھے کہ اہلِ تشیع کسی سیاسی طاقت کے حامل نہیں ہیں اور حالات بھی اس طرح کے تھے کہ وہ مستقبل قریب میں سیاسی طاقت بن کر نہیں ابھر سکتے تھے لہٰذا شیعہ مذہب کی توسیع و ترقی کا صرف یہی ایک راستہ تھا کہ اس مکتبِ فکر کو تقویت پہنچائی جائے اور آئیڈیالوجی کے ذریعہ اسے چار

وانگ ِعالم میں پھیلایا جائے اور کیونکہ اس وقت تک کسی اسلامی فرقہ نے اپنے عقائد کی باقاعدہ طور پر تشکیل نہیں کی تھی لہٰذا جو بھی اس میں سبقت کرتا وہ دوسروں سے آگے بڑھ جاتا اور اپنی پیش قدمی کو جاری رکھ سکتا تھا۔

امام جعفر صادقؑ نے اپنے ماننے والوں کے لئے کوئی انجمن قائم نہیں کی اس لئے کہ یہ اقدام ذوقِ عرب سے ہم آہنگ نہ تھا لیکن آپؑ نے ان کے لئے ایک اکیڈمی کی تشکیل کی۔(۱)

گرجوں کی تعمیر کرنے والے عیسائیوں نے اداروں کی تشکیل کے ذوق کو رومیوں سے سیکھا۔ قدیم رومی، قوانین وضع کرنے اور ادارے قائم کرنے کے شوقین تھے۔ آرتھوڈکس اور کیتھولک گرجوں کی تعمیر انہیں کے انجمن ساز ذوق کا نتیجہ ہے۔

شیعہ مذہب کے لئے امام جعفر صادقؑ کے قائم کردہ علمی مرکز نے اکیڈمی کی صورت اختیار کی جس میں آزادانہ طور پر علمی مسائل کو موضوعِ بحث بنایا جاتا اور کھلے دل کے ساتھ آئیڈیالوجی پر گفتگو ہوتی۔ یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی قائم کردہ ثقافت میں بحث و مباحثہ کی جو آزادی تھی وہ اسلام کے کسی فرقہ میں نہ تھی۔

۱۔ اکیڈمی، یونان کے شہر ایتھنز (Athens) کے قریب ایک باغ تھا جس میں افلاطون اپنے شاگردوں کو درس دیا کرتا تھا۔ افلاطون کے بعد اس کے شاگردوں نے اس باغ کو اپنے مطالعات کا مرکز قرار دیا یہ اکیڈمی تقریباً ایک ہزار سال تک اور تحقیقات کے مطابق ۳۸۷ قبلِ مسیح سے ۵۹۲ بعدِ مسیح یعنی ۹۷۹ سال تک علمی مطالعاتی مرکز بنی رہی۔ یہاں تک کہ بیزانس (رومیہ الصغریٰ) کے بادشاہ "جوس تی نین" نے اس پر تصرف حاصل کیا۔ اس نے اس علمی مطالعاتی مرکز کو ختم کیا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے ایاصوفیہ کے گرجے کو بنایا جو آج بھی استنبول میں مسجد کی شکل میں موجود ہے۔ اس نے شہری قوانین کو ایک مجموعہ کی صورت دی جو ابھی تک "کوڈجوس تی نین" قوانین کے نام سے مشہور ہے لیکن چونکہ اس اکیڈمی میں ایسے خیالات کا اظہار ہوتا تھا جو "جوس تی نین" کے عقیدے کے خلاف تھے اس لئے اس نے اس اکیڈمی کو ختم کر دیا (فارسی مترجم)

شیعی ثقافت میں بحث و مباحثہ کی آزادی

امام جعفر صادقؑ کا مکتبِ فکر دیگر تمام مکاتبِ فکر سے اس لئے بھی ممتاز تھا کہ اس میں بحث کی کھلی آزادی تھی اور اسی خصوصیت کے باعث اسے وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔

ہم گزشتہ صفحات میں یہ بتا چکے ہیں کہ کیتھولک مذہب ایک ہزار سال تک جامد رہا اور آرتھوڈکس فرقہ اب بھی دوسری صدی عیسوی کے افکار و ثقافت کا پابند ہے۔

لیکن شیعی ثقافت کو امام جعفر صادقؑ نے اس طرح تشکیل دیا کہ ابھی دوسری صدی ہجری کا اختتام بھی نہ ہوا تھا کہ اس مذہب نے پھیلنا شروع کردیا، شیعی ثقافت نے صرف ترقی ہی نہیں کی بلکہ وہ دیگر تمام اسلامی فرقوں کے لئے ایک نمونہ بنا تاکہ وہ بھی اپنے عقائد میں بحث و مباحثہ کی گنجائش پیدا کریں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب میں بحث و مباحثہ کی آزادی اسکندریہ کے علمی مکتب سے شروع ہوئی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اسکندریہ کے علمی مکتب میں فلسفہ پر آزاد بحث ہوا کرتی تھی نہ کہ مذہب پر۔ یہ علمی مکتب ساتویں صدی عیسوی تک قائم رہا اور عربوں کے مصر پر حملہ کے بعد غارت ہوگیا۔

اسکندریہ کے علمی مکتب میں فلسفہ کے بعد نجوم، طب، دواسازی، فزکس، کیمسٹری اور کسی قدر میکانکی علوم (MECHANICS) میں دلچسپی لی جاتی تھی لیکن مذہب سے

ان کی دلچسپیاں وابستہ نہ تھیں۔

اسکندریہ کے علمی مکتب کے بعض دانش مند یہودی یا عیسائی تھے لیکن وہ مذہبی مسائل کو علمی بحثوں میں نہیں لاتے تھے۔ کیونکہ یہ علمی مکتب لا دینیت کے لئے مشہور تھا۔ اور اسی لئے اس میں مذہبی مسائل زیرِ بحث نہیں آتے تھے۔

سب جانتے ہیں کہ اسکندریہ کا علمی مکتب اس کتب خانے کے قیام سے عمل میں آیا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کتب خانہ کو مصر کے بادشاہ ''بطلیموس اوّل'' نے تعمیر کرایا تھا۔ جس کی سن وفات ۳۵۸ قبل مسیح ہے۔

یہ تعارف بھی محتاجِ تفصیل نہیں کہ مصر پر ڈھائی صدیوں تک حکومت کرنے والے سلسلۂ بطالسہ کے بادشاہ جن کا پہلا حکمران ''بطلیموس اوّل'' تھا۔ نسلی اعتبار سے یونانی تھے اور یونان کے خداؤں کی پرستش کرتے تھے لیکن بادشاہ ہونے کے باوجود ان کا مذہبی عقیدہ مکتبِ اسکندریہ کے علمی مباحث میں داخل نہ ہو سکا۔اس علمی مکتب کا پہلا فارغ التحصیل دانش مند شکاک ''پیرون'' تھا۔

پیرون مستقل طور پر اسکندریہ کا رہنے والا نہ تھا لیکن وہ اس علمی مکتب کا تربیت یافتہ ضرور تھا۔ اور اس مکتب کی تاثیر نے اسے بری طرح شکی بنا دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ دنیا میں کسی حقیقت کا وجود محال ہے اس لئے کہ ایسا کوئی نظریہ نہیں جو کسی اور نظریہ سے رد نہ ہوتا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ پیرون کو مکتبِ اسکندریہ نے شکی نہیں بنایا تھا بلکہ یہ کیفیت اس میں فطری طور پر موجود تھی لیکن اس مکتب میں علمی بحث و مباحثہ کی آزاد فضا نے اس کی اس کیفیت کو ابھارا اور تقویت دی یہاں تک کہ وہ پورے طور پر حقیقت کا منکر بنا۔ اگر سلسلۂ بطالسہ کے مصری بادشاہوں کا دین اسکندریہ کے علمی مکتب میں سرائیت کرتا تو پیرون اتنی آسانی کے ساتھ ہر حقیقت کی تردید نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بطالسہ کے بادشاہوں کے مذہب میں یونانی خداؤں کا وجود ناقابلِ تردید تھا۔

اس مقام پر ہم پیرون کے فلسفہ پر بحث کرنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ عمل ہمیں اصل

موضوع سے دور لے جائے گا۔ ہمارا مدعا صرف یہ بتانا ہے کہ اسکندریہ کے علمی مکتب میں مذہبی امور پر گفتگو نہیں ہوتی تھی کیونکہ یہ مکتب علمی مباحث کے اعتبار سے لادین تھا۔

مذہبی مسائل پر بحث کی آزادی کا آغاز اس وقت ہوا جب امام جعفر صادقؑ نے شیعی ثقافت کی بنیاد ڈالی۔ اس مکتبِ فکر میں مذہبی مباحث، علمی مباحث میں شامل ہونے لگے اور اس کے بعد اس کا جز بن گئے۔ اس کے بعد کی صدیوں میں شیعہ علماء نے اس مذہب کو علمی قوانین سے ثابت کیا اور یہ روش آج بھی جاری ہے۔

شیعہ مذہب کی اس جدت کو بعد میں دوسرے مذاہب نے بھی اپنایا اور انہوں نے بھی اپنے مذاہب کی حقانیت کو علمی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔

یہ بات سب پر واضح ہے کہ کسی مذہب نے اپنی سچائی کے لئے اپنے آغاز ہی سے علمی دلائل کو پیش نظر نہیں رکھا۔ دینِ اسلام بھی آغاز میں دینِ مسیح اور دینِ موسیٰؑ کی طرح علمی دلائل پر متکی نہ تھا۔ اور آج جب کہ دینِ موسیٰؑ کو ۳۰، دینِ مسیح کو ۲۰ اور دینِ اسلام کو ۱۴ صدیاں بیت چکی ہیں، بیشتر اہلِ نظر کا یہ خیال ہے کہ دین کو علمی استدلال سے کوئی سروکار نہیں بلکہ اس کا تعلق قلب و احساس سے ہے۔

تمام آرتھوڈکس علماء اسی نظریہ کے قائل ہیں۔ اس کے علاوہ کیتھولک علماء کی کثیر تعداد بھی اسی طرزِ فکر کی حامل ہے اور دین کو علم سے الگ رکھنا چاہتی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ دین ایک ایسا نظریہ ہے جس کو علم سے ثابت نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس لئے کہ اگر احکامِ دین علمی استدلال سے ثابت نہ بھی ہوں تب بھی ان کے نزدیک دین کی حقانیت پر کوئی آنچ نہیں آتی اس لئے کہ دینِ مسیح کا سرچشمہ عشق ہے نہ کہ علم۔ بالفاظ دیگر اسے عقل سے سروکار نہیں بلکہ عشق اس کا سرچشمۂ حیات ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں کے دینی مدرسوں میں صدیوں تک علوم کی تدریس نہیں ہوتی تھی کیونکہ ان کے عقیدے میں دین کا مصدر علم نہیں تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں کلاسیکی مواد کے علاوہ مذہبی تعلیمات اور مسیحی فقہ کو بھی دستور یا

قانون کے نام سے دروس میں شامل کر لیا گیا اور یہ سلسلہ آج بھی ان مدارس میں خاص طور سے کیتھولک تعلیم گاہوں میں رائج ہے۔

پس عیسائیوں کے دینی مدرسوں میں جس علم کی تدریس ہوتی تھی اس کا تعلق فقط قانون یا مذہبی حقوق سے تھا۔ فزکس' کیمسٹری'نجوم' ہندسہ' طب 'میکانکی علوم (MECHANICS) کے لئے ان مدرسوں کے دروازے پورے قرونِ وسطیٰ میں بند تھے۔ اس کے علاوہ وہاں فلسفہ کی تعلیم بھی ممنوع تھی کیونکہ وہ لوگ ان علوم کو ضرر رساں جانتے تھے۔

امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ وہ پہلا مذہبی مکتب تھا جس میں فلسفہ کے ساتھ ساتھ ان دیگر علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ امام جعفر صادقؑ خود ان علوم کی تدریس فرماتے تھے۔ حالانکہ ابھی عربی زبان میں یونانی حکماء کی کتابوں کے ترجموں نے اتنی وسعت حاصل نہیں کی تھی۔

اس بات کا قوی احتمال ہے کہ یونانی حکماء کے فلسفی نظریات بھی بعض قبطی دانشوروں کے ذریعہ مصر کے راستے مدینہ اور پھر امام جعفر صادقؑ تک پہنچے ہوں۔ یہ قبطی دانشور مکتبِ اسکندریہ میں آزاد بحث کے پیروکار (حامی) تھے۔ اور یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ تمام قبطی پیشواؤں کو فلسفہ سے دلچسپی نہیں تھی۔

وہ تمام کے تمام عیسائی آرتھوڈکس فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے نزدیک فلسفہ ایک ضرر رساں علم تھا۔

بہرحال فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والے قبطی علماء کی تعداد بہت مختصر تھی پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ ان ہی کے توسط سے مدینہ پہنچا ہوگا۔ اسلام میں امام جعفر صادقؑ سے قبل کسی مدرّس نے اس کو اپنا موضوعِ درس نہیں بنایا اور یہ جو آج ہم شیعہ مدارس اور دیگر اسلامی فرقوں میں اس کا زور دیکھ رہے ہیں یہ اسی ابتکار کا نتیجہ ہے جسے امام جعفر صادقؑ نے صدیوں پہلے عملی جامہ پہنایا تھا۔

امام جعفر صادقؑ کے فلسفی مباحث' افلاطون اور ارسطو کے نظریات ہوا کرتے تھے

اور چونکہ آپؑ نے تدریسِ فلسفہ کی بنیاد ڈالی اس لئے بعد کے ادوار میں شیعہ مدارس نے اس علم کو اپنے طرزِ تعلیم میں شامل کر لیا۔

اسلام کے دوسرے فرقوں میں فلسفہ کی تعلیم شاذ و نادر ہی مشاہدہ میں آتی ہے۔ اور یہی وہ موضوع ہے جو یہ بتاتا ہے کہ فلسفہ کی وابستگی شیعی مکتبِ فکر کے ساتھ رہی ہے اور علاوہ شیعہ مکتبِ فکر کے' اب بھی بعض اسلامی فرقوں میں اس موضوع کو بے کار' ناقابلِ توجہ اور مذہب کے اعتبار سے بے اثر سمجھا جاتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ امام جعفر صادقؑ نے عرفان کو بھی اپنا موضوعِ درس بنایا۔ آپؑ کا عرفان مکتبِ اسکندریہ اور مشرق کے عرفان سے وابستہ تھا۔ آپؑ نے ان دونوں کی مدد سے ایک نیا عرفانی مکتب قائم کیا جس کو آپؑ کے ماننے والوں نے جعفری عرفان کا نام دیا۔ جعفری عرفان کا مشرق اور اسکندریہ کے عرفان سے تقابل یہ واضح کرتا ہے کہ جعفری عرفان نے تزکیہ نفس اور اخلاقی امور کی طرح دنیاوی امور کو بھی قابلِ توجہ قرار دیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے خاص طور پر اخروی امور پر ہی تکیہ نہیں کیا بلکہ آپؑ نے دنیوی امور' اخلاق اور تزکیہ نفس پر زیادہ زور دیا۔ گویا آپؑ یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ جو ان امور میں کوشاں رہا آخرت میں اچھی جزا کا حق دار ہے اور یہ دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے جو کچھ اس میں بویا جائے گا آخرت میں وہی کاٹا جائے گا۔ وہ لوگ جو اس دنیا میں اپنی دنیوی اور اخروی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں انہیں دوسری دنیا میں اپنے انجام سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے اور یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ انہوں نے آخرت کے لئے کوئی توشہ فراہم نہیں کیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ کا عرفان دوسرے مکاتبِ فکر میں پائی جانے والی مبالغہ آرائیوں سے یکسر پاک ہے۔ جس میں خالق و مخلوق کی وحدت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

آپؑ کے عرفان میں انسان اگر نیکوکار ہو گا تو موت کے بعد خدا سے قریب ضرور ہو گا مگر اس سے ملحق نہیں ہو گا۔ کیونکہ مخلوق خالق سے ملحق نہیں ہو سکتی اور جو فاصلہ

مخلوق کو خالق سے جدا کرتا ہے وہ کم ہو سکتا ہے لیکن ختم ہرگز نہیں ہو سکتا۔

امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ ہر طرح کی بحث کی پابندیوں سے آزاد تھی۔ اس میں شاگرد کو کھلی آزادی تھی کہ وہ اپنے استاد پر نکتہ چینی کرے اور اگر ہو سکے تو اس کے نظریہ کی تردید بھی کرے۔ امام جعفر صادقؑ اپنے نظریہ کو اپنے شاگردوں پر مسلط نہیں کرتے تھے بلکہ وہ انہیں آزاد چھوڑ دیتے تھے کہ اگر ان کا دل چاہے تو وہ اسے قبول کریں وگرنہ رد کرنے میں کوئی روک ٹوک یا قباحت نہ تھی۔

آپؑ کے نظریہ کی تصدیق اور قبولیت کا ایک سبب آپؑ کے درس کی تاثیر تھی۔ جو لوگ آپؑ کی درس گاہ میں شرف یاب ہوئے تھے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپؑ سے وابستہ ہو کر انہیں کوئی مادی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک عرصے تک اگر کوئی مدینے سے باہر اپنے آپ کو امام جعفر صادقؑ کا گرویدہ ظاہر کرتا تھا تو بس اس کی جان خطرے میں ہوتی تھی کیونکہ امّوی حکام انہیں دشمن کی نگاہ سے دیکھتے تھے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان میں مخالفت کی طاقت نہیں ہے۔ مگر چونکہ وہ انہیں دشمن گردانتے تھے اس لئے انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ فرصت ملتے ہی وہ اپنی دشمنی کا اظہار کریں گے۔

آپؑ کے شاگردوں کو ان باتوں کا علم تھا کہ ان کے لئے ترقی کی راہیں مسدود ہیں کیونکہ امام جعفر صادقؑ امّوی حکام کی طرح کسی دنیاوی منصب کے حامل نہیں تھے جس کے ذریعے وہ اپنے شاگردوں اور چاہنے والوں کو کوئی مقام عطا کر سکیں۔

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ امام جعفر صادقؑ کے پاس اتنی دولت بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی جیبِ خاص سے ان کی مدد کر سکیں۔ اس کے باوجود جو چیز انہیں آپؑ کی درس گاہ کی طرف کھینچ لاتی تھی وہ آپؑ کی قوتِ کلام اور اس کلام پر آپؑ کا ایمان تھا اور کیونکہ امام جعفر صادقؑ کو اپنی بات پر بھروسہ اور یقین تھا اس لئے آپؑ کی بات آپؑ کے شاگردوں پر مؤثر واقع ہوتی تھی۔

آپؑ اپنی طرزِ حیات میں اس ڈگر پر نہیں چلتے تھے جسے سولھویں صدی عیسوی کے

بعد سے "یوتوپیا" کا نام دیا گیا۔ (۱)

امام جعفر صادقؑ اپنے شاگردوں کو کسی ایسے آئیڈیل نظام سے روشناس نہیں فرماتے تھے جو تصوّراتی حد تک محدود ہو اور اسے عملی صورت نہ دی جا سکے۔

آپؑ کے پدرِ گرامی امام محمد باقرؑ کے زمانے میں جو شاگرد ان کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے یہ توقع رکھتے تھے کہ انہیں دنیوی مقام حاصل ہو اور وہ قاضی کے عہدوں پر فائز ہوں ۔ کیونکہ اموی خلیفہ ولید بن عبدالمالک نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ امام محمد باقرؑ کی درس گاہ سے فارغ التحصیل افراد میں سے کچھ کو منصبِ قضاوت کے لئے انتخاب کرے گا۔

لیکن امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ میں تعلیم پانے والے افراد کے لئے ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اور وہ صرف کسبِ معرفت کے لئے علم حاصل کر رہے تھے۔

مصر پر عربوں کے حملے اور اسکندریہ کی تباہی سے پہلے مکتبِ اسکندریہ اور امام جعفر صادقؑ کا مکتب دونوں بحث و مباحثہ کی آزادی کے قائل تھے لیکن ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ مکتبِ اسکندریہ مذہبی بحث و مباحثہ کی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن امام جعفر صادقؑ کے درس میں مذہب پر بھی گفتگو ہوتی تھی اور شاگردوں کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ استاد کے نظریہ پر اعتراض کریں۔

بحث و مباحثہ کی اسی آزادی نے شیعی مکتبِ فکر کو فروغ دیا کیونکہ اس میں جبراً کوئی

۱۔ یوتوپیا دو یونانی جملوں (یو) یعنی نہیں یا (لا) اور "توپیا" یعنی مکان کا مرکب ہے اور اصطلاحاً یہ ایک تصوّراتی ملک کا نام ہے جو ایک آئیڈیل (لیکن غیر عملی اور تصوّراتی) نظام کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ یوتوپی ایک کتاب کا نام بھی ہے۔ جسے انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم کے صدرِ اعظم "تھامس قدر" نے پندرھویں صدی عیسوی کے نیمۂ دوم میں لکھا جس میں سوسائٹی پر گفتگو کی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ "تمام افراد معاشی یا مادی بضاعت کے اعتبار سے برابر ہیں۔" "تھامس مور" نے ۱۵۳۵ء میں سزائے موت پائی اور جس وقت اس کا سر تبر سے جدا کیا گیا اس وقت اس کی عمر ۹۵ سال تھی ۔ (فارسی مترجم)

بات منوائی نہیں جاتی تھی بلکہ ماننے والا باطنی میلان سے اس کو قبول کرتا تھا۔ اس آزادیٔ فکر و نظر نے لوگوں کو اپنی طرف جذب کیا اور لوگ مادی فائدے کو بالائے طاق رکھ کر صمیم قلب کے ساتھ اس طرزِ فکر اور پھر شیعہ مذہب کے گرویدہ ہو گئے۔

مشرق کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ صفوی خاندان سے قبل مشرقی ممالک میں شیعہ حکومتیں یا ایسی حکومت جس کا سربراہ شیعہ ہو بہت ہی کم تھیں جن میں آلِ بویہ کا خاندان شامل ہے اگرچہ سلاطینِ آلِ بویہ نے شیعہ مذہب کو پھیلانے کے لئے اقدامات کئے مگر ان کے اقدامات نے جبر کی راہ اختیار نہیں کی بلکہ یہ کام شیعی ثقافت سے استفادہ کرتے ہوئے عمل میں آیا جس کا ایک جزو محرم ۶۱ ہجری کے واقعاتِ کربلا بھی ہیں۔ آلِ بویہ کے بعد مشرقی ممالک میں شیعہ سلاطین کی کوئی مستقل حکومت نظر نہیں آتی۔ سوائے اس موقع کے کہ جب صفوی خاندان نے اقتدار سنبھالا۔

شیعہ اقتدار کی اس قلیل سی مدت کو ایک طرف رکھ کر دیکھا جائے تو یہ مذہب حکومتوں کی سخت مخالفتوں کے باوجود پھیلتا رہا اگرچہ اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی لیکن کیونکہ اس کے پاس ایک محکم، بسیط اور ناقابلِ شکست سرمایہ تھا اس لئے وہ سینکڑوں سال جابر حکمرانوں اور شیعہ دشمن حکام کے مقابل مضبوطی کے ساتھ قائم رہا حالانکہ حکومت کی سرپرستی حاصل نہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مادی اعتبار سے بھی کمزور اور بے سہارا تھا۔

بعض اقوام ایسی بھی تھیں جنہوں نے اقتدار میں آئے بغیر صدیوں زندگی گزاری اور مخالفتوں کا شکار بھی رہیں البتہ ان کی مادی حالت بڑی مستحکم تھی۔ مثلاً یورپ میں آباد قرون وسطیٰ کے یہودی جن سے نہ صرف یہ کہ عام انسان بلکہ حکام یہاں تک کہ بعض سلاطین بھی قرض لیا کرتے تھے اور چونکہ وہ مادی اعتبار سے ان کی احتیاج پوری کیا کرتے تھے لہٰذا انہیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے یہودیوں کا طرزِ زندگی وہاں کے عیسائیوں سے مختلف نہ تھا مگر یہ کہ یورپ کے بعض

شہروں میں ان کے رہنے کے لئے ایک جداگانہ مقام معین تھا۔

امام جعفر صادقؑ کے ہزار سال بعد جب یورپ کو قرونِ وسطیٰ کے اندھیروں سے نجات ملی اور لوگوں کے افکار میں بالیدگی پیدا ہوئی تو اس وقت بھی فرانس' اٹلی' اسپین اور پرتگال جیسے یورپی ممالک میں اگر کوئی شخص کیتھولک مذہب کے فروعی مسائل پر بھی معمولی سا اعتراض کرتا تو اسے سخت ترین سزاؤں سے دوچار ہونا پڑتا' چہ جائے کہ کوئی اصول پر اعتراض کرے۔

اٹلی کے پادری "برونو" نے کیا کہا تھا جسے زندہ جلا دیا گیا؟

"برونو" ۱۶۰۰ عیسوی میں کہ جس کے بعد سترہویں صدی شروع ہوتی ہے ایک ایسی بات پر زندہ جلا دیا گیا جس کا تعلق کسی بھی لحاظ سے کیتھولک مذہب کے نہ اصول سے تھا اور نہ فروع سے۔

"برونو" نے کہا تھا کہ "ہر شخص عقلی بلوغ میں داخل ہونے کے بعد دنیا اور زندگی کے بارے میں اپنی عقل اور استنباط کے مطابق ایک عقیدہ کا قائل ہو جاتا ہے۔"

بس اسی معمولی سے نظریے نے "برونو" کو زندہ جلوا دیا۔

جس وقت اسے جلایا گیا اس کی عمر ۵۲ سال تھی۔ تمام عمر اس کا کام محتاجوں اور بیواؤں کی امداد اور ان کی دستگیری تھا۔ وہ مفلس اور تنگ دست مریضوں کے لئے علاج و معالجہ کے وسائل بھی فراہم کرتا تھا۔ جس طرح چیونٹی اس بات سے خوش ہوتی ہے کہ وہ اپنی خوراک دوسرے کو دے دے اور خود بھوکی رہے اسی طرح "جیوردنے انو برونو" کو بھی اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر دوسروں کو سکھ پہنچانے سے خوشی حاصل ہوتی تھی۔

پادری کا مقام حاصل کرنے کے بعد سے قید میں ڈالے جانے تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی ضرورت مند اس کے پاس آئے اور ناامید واپس جائے۔ وہ جہاں کہیں رہتا اس کے گھر کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا۔ رات کے وقت بھی اس کا دروازہ بند نہیں ہوتا تھا۔ شب کے کسی حصے میں کوئی حاجت مند اس کے پاس آتا تو وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا اور اپنی

استعداد کے مطابق اس کی حاجت روائی کرتا تھا۔

جس روز ونز کے بڑے میدان میں اسے جلایا جا رہا تھا اس وقت مسلح سپاہیوں کی بڑی تعداد اس بات پر مامور تھی کہ لوگوں کے اژدھام کو آگے بڑھنے سے روکے اور انہیں "برونو" تک نہ پہنچنے دے۔ جب "برونو" کو اس میدان میں لا کر لکڑیوں کے ڈھیر کے درمیان واقع ایک ستون سے باندھا گیا تو یہ منظر دیکھ کر تمام مجمع رونے لگا۔ جلاّد نے تیل سے بھیگی ہوئی لکڑیوں کے قریب مشعل رکھ دی اور محتاجوں اور درد مندوں کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے والا انسان ہولناک چیخوں کے ساتھ نذر آتش ہو گیا۔ فضا جلے ہوئے گوشت کی بدبو سے بھر گئی اور "برونو" کی عمر بھر کی نیکیاں بھی اسے اس دردناک موت سے نہ بچا سکیں۔

آج "برونو" کی کہی ہوئی بات کی حقیقت سب پر عیاں ہے اور ہم اسے منطقی اور قابلِ قبول سمجھتے ہیں۔ لیکن سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں محکمۂ تفتیشِ عقیدہ نے اس کی اس بات کو مسیحی مذہب کی مخالفت پر محمول کیا اور یہ فیصلہ دیا کہ ہر عیسائی کے لئے ضروری ہے کہ وہ عقلی بلوغ میں داخل ہونے کے بعد دنیا کو اسی طرح سمجھے اور وہی عقیدہ رکھے جسے مقدّس کتاب (عہدِ عتیق) اور (عہدِ جدید) نے لکھا ہے اور اپنی عقل اور استنباط کو اس میں دخل نہ دے۔ اور چونکہ "برونو" نے کہا ہے کہ "انسان" دنیا کے بارے میں اپنی عقل و استنباط کے مطابق فیصلہ کرتا ہے لہٰذا وہ مرتد ہے اور اس کے ارتداد کا سبب یہ ہے کہ شیطان نے اس میں حلول کیا ہے اب اس کو جلا دیا جانا چاہیئے تاکہ شیطان اس کے بدن سے خارج ہو جائے۔

لیکن شیعہ مکتبِ فکر میں گوناگوں مسائل پر مباحثہ کی اتنی آزادی تھی کہ تیسری صدی ہجری کے نیمۂ اوّل میں ابنِ راوندی جیسا شخص دنیائے اسلام میں ظاہر ہوا۔

---☆---☆---

ادب امام جعفر صادقؑ کی نظر میں

ہم نے عباسی خلفاء کے دارالحکومت میں ابنِ راوندی کی زندگی سے متعلق یہ مختصر گفتگو اس لئے پیش کی تاکہ یہ بتاسکیں کہ امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت میں بحث و مباحثہ کی کس قدر آزادی تھی۔ اور کسی شخص کو اس کے نظریات کی بنیاد پر آزار نہیں پہنچایا جاتا تھا۔

اسی ابنِ راوندی کو جو عراق (عجم) میں امام جعفر صادقؑ کے مکتبِ ثقافت میں جو چاہتا لکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عباسی خلفاء کے دورِ حکومت میں اپنی تحریر کی بناء پر دو مرتبہ موت کے منہ میں گیا۔ پہلی مرتبہ خلیفہ اور دوسری مرتبہ اہلِ تصوّف اس کے جانی دشمن بن گئے اور اگر دوسری بار عباس صرمِ اس کے کام نہ آتا تو یقیناً اس کا کام تمام ہوگیا ہوتا۔

امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کے استحکام کا راز یہ تھا کہ اس ثقافت کے چار ارکان میں سے فقط ایک رکن مذہب سے متعلق تھا اور باقی تین ارکان ادب، علم اور عرفان سے متعلق تھے۔

دنیا کی تاریخ میں امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کے برابر کسی مذہبی ثقافت میں علم

وادب کو اتنی اہمیت حاصل نہیں۔ آپؑ کی مذہبی ثقافت میں علم و ادب کی اتنی اہمیت تھی کہ محقق کو اپنے آپ سے یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ اس مذہبی ثقافت میں ادب اور علم کی زیادہ اہمیت تھی یا مذہب کی؟

آپؑ جانتے تھے اور آپؑ نے یہ ارشاد بھی فرمایا کہ مومن کو مستحکم ایمان کا حامل بننے کے لئے علم و ادب سے کام لینا چاہئے۔

آپؑ نے فرمایا ہے کہ ایک عام انسان کا ایمان بالکل سطحی اور غیر مستحکم ہے۔ ایک عام فرد ہونے کی حیثیت سے وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیوں اور کس پر ایمان رکھتا ہے؟ اور چونکہ اس کے ایمان میں استحکام نہیں لہٰذا وہ کسی بھی وقت اسے کھو سکتا ہے لیکن وہ مومن جو علم و ادب کا حامل ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیوں اور کس پر ایمان رکھتا ہے اور اسی لئے مرتے دم تک اس کا ایمان متزلزل نہیں ہوتا۔ امام جعفر صادقؑ نے یہ بتانے کے لئے کہ علم و ادب کس طرح ایمان کو استحکام بخشتے ہیں دوسرے مذاہب کی مثال پیش کی اور فرمایا کہ جب اسلام وسعت پا کر جزیرۃ العرب سے دوسرے ملکوں میں داخل ہوا تو وہاں کے عام لوگوں نے فوراً ہی اسے قبول کرلیا جب کہ علم و ادب کے حامل افراد نے تامل سے کام لیا اور جب ان پر یہ ثابت ہوا کہ اسلام، دینِ دنیا و آخرت ہے تب وہ اس پر ایمان لائے اور انہوں نے اسے قبول کیا۔

امام جعفر صادقؑ نے ادب کی وہ تعریف کی ہے کہ ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے زیادہ جامع تعریف کبھی کسی دانشمند کے ذہن میں ابھری ہو۔ آپؑ نے فرمایا کہ "ادب ایک پوشاک کا نام ہے جسے بولنے والے اور لکھنے والے اپنی تقریروں اور تحریروں کے زیب تن کرتے ہیں تاکہ وہ پڑھنے والے کے ذہن اور سننے والے کی سماعت پر زیادہ خوبصورت اور زیادہ دلکش انداز سے رونما ہو۔"

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ بولا یا لکھا جاتا ہے وہ اس پوشاک کے بغیر بدصورت و بدنما ہے۔ آپؑ اس پوشاک کے بغیر بھی تقریر و تحریر کو خوشنما اور دلنشین جانتے ہیں۔ تاہم آپؑ کا کہنا یہ ہے کہ جب انہیں ادب کی

پوشاک پہنائی جاتی ہے تو وہ کہیں زیادہ دلکش اور توجہ کا باعث بنتے ہیں۔ کیا امام جعفر صادقؑ کی رحلت کے بعد سے آج تک اس ساڑھے بارہ سو سال میں کسی نے ادب کی اتنی مختصر، اتنی جامع اور منطقی تعریف کی ہے؟

ادب کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کا دوسرا نظریہ آپؑ کا یہ ارشاد ہے!

"ممکن ہے ادب کوئی علم نہ ہو تاہم کوئی علم ادب سے خالی نہیں" اور یہ بھی علم اور ادب کے ارتباط سے متعلق ایک نہایت مختصر اور جامع تعریف ہے۔

ہم یہ اندازہ نہیں کرسکتے کہ امام جعفر صادقؑ کو ادب سے زیادہ دلچسپی تھی یا علم سے؟ آپؑ کے ذہن میں شعر کی زیادہ اہمیت تھی یا علم طبیعیات کی؟ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جنہیں علم اور ادب دونوں سے یکساں دلچسپی رہی ہو۔ کیونکہ قریب قریب تمام نوع بشر کی فکری استعداد کچھ اس انداز کی ہے کہ وہ یا ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں یا علم سے۔

ادب سے شغف رکھنے والے علم کو ایک خشک اور خشن موضوع اور مادی فوائد و آسائش حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جس میں زندگی کا مقصد سوائے دوسروں کو دبانے اور نقصان پہنچانے کے اور کچھ نہیں ہوتا اور اپنے آپ کو علم کی طرف جانے والوں سے زیادہ باذوق اور باسلیقہ تصور کرتے ہیں۔

علمی استعداد کے حامل افراد ادب کو طفلانہ سرگرمیوں یا تصوّراتی مشاغل میں شمار کرتے ہیں اور ایک مستعد انسان کو اس سے بالاتر سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ادب سے وابستہ کرے۔

سوداگروں اور تجارت پیشہ گروہ کے نزدیک ادب وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ گروہ ان لوگوں کی عقلِ سلیم پر بھی شبہ کرتا ہے جو ادب کو اہمیت دے کر اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس میں صرف کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عقلِ سلیم کے حامل افراد کبھی اپنی عمر کو ان امور میں ضائع نہیں کرتے جن سے انہیں کوئی مادی فائدہ حاصل نہ ہو۔ ہمیں اس گروہ سے کوئی مطلب نہیں کیونکہ اس گروہ کی نظر میں نہ صرف یہ کہ

ادب کی کوئی قدروقیمت نہیں بلکہ اس وقت تک علم کی بھی کوئی وقعت نہ تھی جب تک اس نے صنعت کو وجود نہیں بخشا۔ لیکن جب علم نے صنعت کو فروغ دیا تو چونکہ صنعت، دولت و ثروت کی آماجگاہ تھی لہٰذا قابلِ قدر سمجھی گئی۔ اور علم کی اس قدروقیمت کا آغاز بھی اٹھارویں صدی عیسوی سے ہوا جب تاجروں نے ایسی صنعتوں کی طرف توجہ دی جن کے ذریعہ زیادہ منفعت حاصل کی جاسکتی تھی۔

امام جعفر صادقؑ ان شاذ و نادر اشخاص میں تھے جنہیں علم و ادب دونوں سے شغف تھا۔ آپؑ جس مقام پر درس دینے کے لئے بیٹھتے تھے وہاں آپؑ کے بالائے سر یہ شعر لکھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

لیس الیتیم قد مات والده
ان الیتیم یتیم العلم والادب

یعنی "یتیم وہ نہیں جس کا باپ مرگیا ہو بلکہ یتیم وہ ہے جو علم وادب سے بے بہرہ ہو۔"

امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کے وجود میں آنے سے قبل، عربوں میں ادب کا اطلاق شعر پر ہوتا تھا۔ اور ہم کہہ چکے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں عربوں کے پاس نثری ادب کا فقدان تھا۔ اور پہلی صدی ہجری میں عربوں کے پاس نثر میں ادبی آثار بہت ہی کم تھے۔ جس میں نمایاں ترین یادگار حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی "نہج البلاغہ" ہے۔

امام جعفر صادقؑ دوسری صدی ہجری کے نیمہء اوّل میں نثری ادب کی جانب مائل ہوئے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ عربی زبان کا نثری ادب سے رشتہ استوار کرنے والی ہستی آپؑ ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ ہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے عربوں میں ادبی انعامات کو برقرار کیا۔

اگر ادبی انعامات سے مراد یہ ہو کہ شاعر یا لکھنے والے کو کوئی صلہ ملے تو یہ روایت

درست نہیں کیونکہ شعراء کے لئے انعام کا طریقۂ کار قدیم زمانے سے جزیرۃ العرب میں رائج تھا اور ظہورِ اسلام کے بعد بھی یہ رسم جاری رہی۔ جب کوئی شاعر اپنے خوبصورت شعر کو کسی رئیس کی خدمت میں پیش کرتا تو اسے انعام ملتا تھا۔

لیکن نثری ادب میں اس رسم کی ابتداء امام جعفر صادقؑ نے کی۔ عرب قوم، ظہورِ اسلام سے قبل اور اس کے بعد پہلی صدی ہجری میں نثری ادب کو ادبی آثار میں شمار ہی نہیں کرتی تھی چہ جائے کہ ان کے لکھنے والوں کو انعام و اکرام سے نوازے۔ نثری آثار پر انعام کی رسم ایک روایت کے مطابق امام جعفر صادقؑ نے ایجاد کی۔

ہمیں اس بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے نثر کے ادبی آثار لکھنے والوں کے لئے انعامات کا انتظام کیا لیکن اس بات میں شبہ ہے کہ کیا آپ ہی وہ فردِ اوّل ہیں جنہوں نے ادیبوں کو انعام و اکرام سے نوازا یا آپؑ سے پہلے آپؑ کے پدرِ بزرگوار امام محمد باقرؑ نے اس رسم کو جاری کیا۔

ابتداء میں امام جعفر صادقؑ اور ان کے دو شاگرد ادبی انعام کے مستحق افراد کا انتخاب کرتے تھے۔ لیکن بعد میں ان کی تعداد پانچ ہوگئی۔ اور جب ان میں سے تین افراد کسی لکھنے والے کے بارے میں متفق الرائے ہوتے تو اسے انعام کا حقدار قرار دیا جاتا تھا۔

امام جعفر صادقؑ کا نثری ادب کے پھیلاؤ میں ایک کردار یہ بھی تھا کہ آپؑ لکھنے والوں کو مجبور نہیں کرتے تھے کہ وہ کسی خاص موضوع پر قلم فرسائی کریں ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق مضمون انتخاب کرنے میں آزاد تھا۔ مضمون کی تکمیل کے بعد وہ اسے امامؑ کی خدمت میں پیش کرتا اور آپؑ اسے پانچ افراد پر مشتمل کمیٹی کے سپرد کردیتے۔ اب اگر ان میں سے تین افراد اس لکھنے والے کو انعام کا حقدار قرار دیتے تو اسے انعام دیا جاتا ۔امام جعفر صادقؑ نے فراخدلی کے ساتھ نظم و نثر دونوں کو ادب میں شامل کیا۔ آپؑ کی نظر میں فقط شعر کہنے والا یا فی البدیہہ تقریر کرنے والا یا لکھ کر اسے پڑھنے والا ہی ادیب نہ تھا بلکہ جو کوئی جس موضوع پر نظم یا نثر میں زیادہ دلکش اندازِ تحریر اختیار کرتا وہ ادیب

کہلاتا۔ آپؑ علم اور ادب کو نہ صرف مذہبی ثقافت کے اعتبار سے ضروری جانتے تھے بلکہ ارتقاءِ بشر اور مستحسن صفات کی تقویت کے لئے بھی اسے ضروری سمجھتے تھے۔

آپؑ جانتے تھے کہ جس قوم میں ادباء اور علماء کی فراوانی ہوگی وہاں مشکل ہی سے کسی کا حق سلب ہوگا اور اگر پوری قوم علم و ادب سے بہرہ ور ہو تو زندگی کے تمام شعبوں میں آسانیاں دکھائی دیں گی۔

امام جعفر صادقؑ نے مذہب، ادب، علم اور عرفان پر مبنی اس چار رکنی مذہبی ثقافت کو شیعہ مذہب کی تقویت و بقاء کے لئے اس سے کہیں زیادہ مفید اور ضروری جانا کہ کوئی اس کے لئے کسی عظیم الشان عمارت کی بنیاد قائم کرے۔

آپؑ نے شیعہ مذہب کے لئے "سن پیرے" کی طرح کسی عمارت کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ اس مذہبی ثقافت کو تشکیل دیا جسے "سن پیرے" سے کہیں زیادہ دوام حاصل ہے۔ "سن پیرے" کے پہلے گرجا گھر کی طرح ایک مذہبی عمارت تباہ ہو سکتی ہے مگر امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ (۱) "سن پیرے" کے پہلے گرجا گھر کی تعمیر

۱۔ فرانسیسی "سن پیرے" "اٹالین" "سینٹ پیٹر" اور لاطینی "سانکتہ پیٹرس" دراصل ایک ہی لفظ ہے جس سے مراد روم کا وہ مشہور و معروف گرجا گھر ہے جو اپنے رقبے اور خوبصورتی کے اعتبار سے دنیائے مسیحیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس عجوبۂ روزگار کو دیکھنے ہر سال ایک کروڑ پچاس لاکھ عیسائی دنیا کے مختلف علاقوں سے روم جاتے ہیں اور آج چار سو سال سے ۵۰ ماہرینِ تعمیر پر مشتمل اٹلی کی ایک جماعت تقریباً ایک سو کاریگروں کے ساتھ مستقل طور پر اس کی تعمیر میں مصروف ہے۔ پچاس ماہرینِ تعمیر کی یہ جماعت جسے اٹلی کی زبان میں "سام پیٹری" کہا جاتا ہے۔ لوگوں کے درمیان بہت قابلِ احترام ہے۔ یہ گرجا گھر اٹلی کے جدید ترین فنِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس عمارت کے اصل حصوں کی تعمیر ۱۲۰ سال میں مکمل ہوئی اور اس کی آرائش کا کام بیسویں صدی تک جاری رہا۔ اگر کیتھولک پادریوں کی مستقل انجمن نہ ہوتی تو آج بھی یہ گرجا گھر نہ ہوتا۔ دوسری عالمی جنگ میں امریکہ اور روس دونوں نے اس چرچ کے احترام میں روم پر بمباری سے صَرفِ نظر کیا۔ (فارسی مترجم)

روم کے پہلے مسیحی بادشاہ "قسطنطین" کی طرف سے ۳۲۶ عیسوی میں شروع ہوئی اور کئی سال بعد اختتام کو پہنچی۔ یہ عبادت گاہ دورِ جدید کے آغاز تک قائم رہی اور کیتھولک مذہب کے پیشوا پوپ "جوئیل دوم" کے حکم سے ڈھا دی گئی اور اس کی جگہ موجودہ "سن پیرے" کا گرجا تعمیر ہوا (۱)۔

اگر امام جعفر صادقؑ بھی شیعہ مذہب کے لئے اسی طرح کی کوئی عظیم الشان عمارت تعمیر کرتے تو ممکن تھا کہ کوئی شخص اس مذہب سے مخالفت کی بناء پر اسے مسمار کردیتا اور آج اس کا نشان بھی باقی نہ رہتا۔ لیکن آپؑ نے شیعی ثقافت کی تشکیل اور اس کے استحکام پر توجہ دی تاکہ یہ ہمیشہ باقی رہے۔ آپؑ نے اس مقصد کے لئے اس کے مذکورہ بالا چار ارکان کو تقویت دی خاص طور پر علم' ادب اور مذہب کے ارکان کو استحکام بخشنے کی کوشش کی اور اس حد تک محنت کی کہ دوسری صدی ہجری کا پہلا نصف حصہ جو آپؑ کی تدریس کا دور تھا' اسلامی دنیا میں علم و ادب کی ترقی کے آغاز کا دور کہلایا اگرچہ آپؑ اکیلے علم و ادب کے محرک نہ تھے تاہم آپؑ نے تن وتنہا اس میدان میں قدم آگے بڑھایا اور دوسروں نے آپؑ کی تاسی کی۔

اگر امام جعفر صادقؑ علم و ادب کی توسیع اور علماء و ادباء کی تشویق کے لئے آگے نہ بڑھتے تو دوسری صدی ہجری کے نیمہ دوم اور پوری تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں عرب ممالک میں رونما ہونے والی عظیم ادبی اور علمی تحریک کا نام ونشان بھی نہ ہوتا۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ علم وادب کی ترویج وترقی کے بانی عباسی خلفاء ہیں وہ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔

۱۔ دورِ جدید سے مراد وہ دور ہے جس میں یورپ نے علم وہنر اور پھر صنعت سے اپنا ناطہ جوڑا۔ مورخین نے اس کا آغاز ۱۴۵۳ میں سقوط قسطنطنیہ سے کیا ہے لیکن امریکہ کی دریافت کے بعد سولہویں صدی عیسوی کے آغاز سے علم وہنر اور پھر صنعت نے یورپ میں پھیلنا شروع کیا۔ (فارسی مترجم)

آغاز میں آنے والے عباسی خلفاء کا اپنی حکومت کے استحکام کے علاوہ اور کوئی منشاء نہ تھا۔ ان کے بعد آنے والوں کو زیادہ تر مادی لذتوں سے بہرہ مندی کی فکر تھی۔ انہوں نے علم و ادب کے سلسلہ میں جو توجہ دی گویا ان کی زندگی کے حاشیہ کی تشکیل تھی (جیسا کہ ہم بطور اختصار متوکّل کے بارے میں عرض کرچکے ہیں)

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں علم و ادب کی طرف عباسی خلفاء کی توجہ محض رسم و رواج کی بنا پر تھی نہ یہ کہ انہیں علم وادب سے کوئی خاص لگاؤ تھا۔

پانچ سو سال مشرق میں حکومت کرنے والے ۳۷ عباسی خلفاء میں سے فقط گنتی کے چند ہی ایسے تھے جنہیں علم و ادب سے دلچسپی تھی ورنہ باقی سب کے سب مادی لذائذ کے حصول سے دلچسپی رکھتے تھے۔

مگر ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس بات سے بھی انکار نہیں کرنا چاہئے کہ انہیں معدودے چند لوگوں کی علم و ادب سے دلچسپی نے اس کی ترویج و ترقی میں ایک موثر کردار ادا کیا اگرچہ یہ دلچسپی ایک رسم کے طور پر ہی کیوں نہ وجود پذیر ہوئی ہو۔

ان کے ہاتھوں میں بیت المال کا اختیار تھا اور اس کے علاوہ وہ ان گراں قدر ہدایات سے بھی کام لیتے تھے جو انہیں وقتاً فوقتاً ملا کرتی تھیں۔ شعراء خطباء اور مبلّغین کے لئے برابر انعامات اس کا سبب بنتے تھے کہ دوسرے بھی اس کی ہوس کریں اور جہاں تک ہوسکے اکتسابِ علم وادب میں کوشاں رہیں تاکہ ان پر بھی خلیفہ کی نظرِ عنایت ہو اور انہیں بھی برابر انعامات سے نوازا جائے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ زمانہء جاہلیت میں عرب کے بدوی قبائل کے رؤسا کے یہاں شعر سننا ایک عام بات تھی۔ اور یہ وہاں کا ایک روایتی طرزِ عمل تھا جسے انہوں نے دوسری قوموں سے اخذ نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود اس کے موجد و بانی تھے۔

بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ کسی قبیلے کے سردار کو شعر سننے سے دلچسپی نہ ہو یا وہ اس کے مفہوم کو درک نہ کرتا ہو لیکن شعر کے مفہوم کو درک نہ کرنے والے بھی ایک سنت یا روایت کے تحت شاعر کے کلام کو سنتے تھے۔

"شوپنہاور" کا کہنا ہے کہ چونکہ بدوی قبائل کے رؤسا کو بیکاری کے سبب تھکاوٹ ہوتی تھی لہٰذا وہ اپنا وقت شاعروں کا کلام سننے میں صرف کرتے تھے۔

"شوپنہاور" بدوی عربوں کے رؤسا کی شعر سے دلچسپی ہی کو ان کی بے کاری کا سبب نہیں جانتا بلکہ اس کی نظر میں تحصیلِ معاش کے علاوہ باقی تمام امور بے کاری میں شمار ہوتے ہیں ــــ کھیل ہو، تفریح ہو یا دعوتیں اور شب نشینیاں، وہ ان سب کو بے کاری کا ایک مشغلہ جانتا ہے۔

اس جرمن فلسفی نے اپنے کام کے کمرے میں بالائے سر اس مضمون کا کتبہ نصب کیا تھا کہ "وہ شخص جو تمہیں دوپہر یا رات کے کھانے پر مدعو کرتا ہے تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ وہ تمہیں کام سے روکتا ہے۔" یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بے کاری کی وجہ سے حکمت و فلسفہ سے وابستہ ہوگیا تھا کیونکہ فلسفہ شوپنہاور کے لئے کسبِ معاش کا وسیلہ تھا اس لئے کہ وہ اس کا درس دیتا تھا۔

شاعر جب سردارِ قبیلہ کے سامنے اپنے اشعار پڑھتا تھا تو اسے انعام ملتا تھا اور رسم

۱۔ مشہور جرمن فلاسفر شوپنہاور نے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۸۶۰ء میں اس دنیا کو خیرباد کہا۔ تاریخ حکمت میں اسے ایک بدبین فلسفی کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ وہ دکھ درد کو انسان کی سرنوشت کا حصہ سمجھتا تھا اور کہتا تھا چونکہ انسان اپنی خواہشات کو جامۂ عمل نہیں پہنا سکتا لہٰذا اسے تکلیف ہوتی ہے اور یہ روحانی اذیت آخری سانس تک اس کے ساتھ رہتی ہے۔ "دنیا فکر و خواہش" اس کی مشہور ترین کتاب ہے۔ شوپنہاور کی نظر میں کوئی شے قابلِ قدر نہیں ہے مگر اخلاق۔ چونکہ اس کے بقول احساس ہمدردی کا نام ہے جو دوسروں کی تکلیف کے مشاہدہ سے انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اس کے نزدیک صحیح طور پر علم وادب کی بھی وقعت نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان اپنے ضعیف احساسات اور مستقل بے کاری سے تنگ آجاتا ہے تو علم وادب سے وابستہ ہو جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اپنے آپ کو مصروف رکھے اور یہ کہ فضل فروشی اور تفاخر سے کام لے کر اپنے حقارت کے احساس میں کمی پیدا کرے۔ (فارسی مترجم)

ادب یہ تھی کہ وہ اپنے کلام میں چند اشعار رئیسِ قبیلہ کی مدح و ثنا کے لئے بھی وقف رکھے۔ البتہ اس کی تعریف ایک معین حد سے آگے نہیں بڑھتی تھی اور دورِ جاہلیت کے شاعر مدح سرائی میں غلو سے کام نہیں لیتے تھے اور اپنے آپ کو قبیلے کے سردار کے سامنے حقیر وذلیل ظاہر نہیں کرتے تھے ان کی مدح اس تشکر کی مانند تھی جو مہمان نوازی کے بعد ایک مہمان میزبان سے کیا کرتا ہے۔

بعض افراد کا خیال ہے کہ "عکاظ" (عکاظ۔ ایک میلہ جو اسلام سے پہلے مکہ میں ہوتا تھا اور تین ہفتے جاری رہتا تھا۔) کی منڈی میں اشعار سنانے والے شعراء لوگوں سے رقم وصول کرتے تھے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

عرب کا شاعر دورِ جاہلیت میں اپنی قدر وقیمت کا قائل تھا اور اپنی شخصیت کو محترم جانتا تھا اور قبائلی رؤسا سے جو صلہ وصول کرتا تھا وہ ایک قسم کی اجرت اور حقِ زحمت ہوتا تھا۔ شعر پڑھنے کے باعث جتنا حق اس کا رئیسِ قبیلہ پر ہوتا تھا اتنا حق اس کا نہیں ہوسکتا تھا جو صلہ دیتا تھا۔ شاعر یہ کہہ سکتا تھا کہ اس نے شعر کہہ کر قبیلہ کے سردار پر احسان کیا ہے مگر قبیلہ کا سردار یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے صلہ دے کر شاعر پر احسان کیا ہے۔

"عکاظ" کے موقع پر شعر پڑھنے والوں کا مقصد تفاخر تھا لوگوں سے کچھ بٹورنا نہ تھا۔ البتہ امام جعفر صادقؑ کے زمانے تک کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ جزیرۃ العرب میں کسی نے قبیلے کے سرداروں کے لئے یا پھر "عکاظ" کے موقع پر کوئی نثری کلام پیش کیا ہو۔ جو کلمات و مضامین شعر کے قالب میں نہ ڈھالے جاتے عرب میں ادب کا حصہ شمار نہ کئے جاتے تھے۔

یہاں تک کہ قرآن نازل ہوا اور قرآن یہی وجہ ہے کہ نثرِ عرب کا پہلا نثری ادب ثابت ہوا لیکن عربوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ قرآن کو ایک ادبی یادگار سمجھیں انہوں نے اسے معجزہ جانا یعنی ایک ایسی شے جو ماوراء ادب اور اس سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے۔ باوجود یہ کہ قرآن نے عرب قوم کو یہ بتایا کہ ایک نثری ادب کو وجود میں لایا جاسکتا

ہے مگر پہلی صدی ہجری میں سوائے حضرت علی ابن ابی طالبؑ آپؑ کے پوتے امام زین العابدینؑ اور پھر امام محمد باقرؑ کے علاوہ پورے جزیرۃ العرب میں کسی نے یہ کوشش نہ کی کہ وہ کتاب لکھے اور ادبی نثر کی تخلیق کرے۔ امام جعفر صادقؑ کے زمانے تک وہ لوگ جو کوئی کتاب لکھنا چاہتے انہیں یہ فکر لاحق ہوتی کہ اپنے افکار کو شعر کے قالب میں سموئیں اور چونکہ شعر بحروں کے اوزان کا پابند ہوتا ہے اور شاعر کو قافیہ کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے لہٰذا وہ آزادی کے ساتھ صحیح طور پر اپنے افکار کو آنے والی نسلوں کے لئے قلمبند نہیں کر سکتے تھے۔

امام جعفر صادقؑ نے نثری ادب کی توسیع کے ذریعہ شعر کے قالب میں محبوس اسلامی مفکرین کے افکار کو بال وپر دیئے اور اس وقت میں جس کسی نے کوئی کتاب لکھنی چاہی اس نے نثر سے استفادہ کیا مگر اس طرح کہ اسلامی ادب میں شعر کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کے بالائے سر جو کتبہ تھا اس پر یہ عبارت درج تھی کہ۔

لیس الیتیم قد مات والدہ
ان الیتیم یتیم العلم والادب

"یتیم وہ نہیں جس کا باپ مرگیا ہو بلکہ وہ ہے جو علم وادب سے بے بہرہ ہو۔"

---☆---☆---

علم امام جعفر صادقؑ کی نظر میں

امام جعفر صادقؑ اس امر کی طرف متوجہ تھے کہ علم و ادب نہ صرف یہ کہ شیعوں کی مذہبی ثقافت کو طاقتور بناتا ہے بلکہ دیگر اقوام کے مقابل مسلمانوں کی تقویت کا ذریعہ بھی ہے۔ چنانچہ علم و ادب نے دنیائے اسلام میں اس حد تک ترقی کی کہ چوتھی صدی ہجری علمی اور ادبی حیثیت سے سنہری صدی قرار پائی اور یورپ والوں نے بھی اسلامی علوم سے بہت فائدہ اٹھایا۔

امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ متعدد علوم میں کون سا علم دوسروں پر ترجیح رکھتا ہے تو آپؑ نے جواب دیا کہ کلّی حیثیت سے تو کوئی علم دیگر علوم پر ترجیح نہیں رکھتا لیکن استفادہ کے مواقع ایک دوسرے میں امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ آدمی بعض علوم سے جلد تر اور زیادہ تر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس دور کی انسانی زندگی میں دو علوم زیادہ فائدہ بخش ہیں ایک علمِ دین اور دوسرا علمِ طب۔

علمِ دین سے آپ کی مراد اس کی فقہ کا بیشتر حصہ تھا اور آپ بتانا چاہتے تھے کہ تمام علوم میں علمِ حقوق و فرائض اور علمِ طب آپ کے زمانہ میں مسلمانوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہیں۔ نیز آپؑ نے فرمایا کہ ایک دن آنے والا ہے کہ جب انسان ان علوم سے بھی استفادہ کرے گا جن سے آج عملی فائدہ اٹھا رہا ہے اور یہ محال ہے کہ

کوئی علم عملی فائدہ نہ رکھتا ہو خلاصہ یہ کہ سارے علوم سے بنی نوع انسان کا عملی استفادہ زمانے کے تقاضوں پر منحصر ہے۔

امام جعفر صادقؑ کا عقیدہ تھا کہ نوع بشر نے اس دنیا کی اپنی طولانی زندگی میں بہت مختصر سے اوقات علم کے لئے وقف کئے ہیں اور زیادہ تر اس سے دور ہی رہا ہے۔ اسے دو چیزوں نے علم سے الگ رکھا ہے۔ اوّل مربّی اور معلّم کی غیر موجودگی جو اسے حصولِ علم کا شوق دلاتا اور دوسری انسان کی کاہلی اور یہ کہ علم حاصل کرنے میں چونکہ زحمت تھی لہٰذا وہ اس زحمت طلب کام سے بھاگتا رہا۔

اگر ہم مثال کے طور پر اس دنیا میں نوعِ انسان کی زندگی دس ہزار برس سمجھ لیں تو کہا جا سکتا ہے کہ آدمی نے اس طولانی مدّت میں سے صرف سو سال حصولِ علم میں صرف کئے ہیں' اگر اس سے زیادہ وقت اس کام میں صرف کیا ہوتا تو آج بہت سے علوم کے عملی فوائد سے بہرہ مند ہوتا۔

یہاں اس نکتے کا ذکر بے محل نہ ہو گا کہ اس دور کے علماء نے عبرانی تقویم سے مطلب اخذ کرتے ہوئے اس دنیا کی عمر چار ہزار سات سو سال سے کچھ زائد قرار دی تھی۔ اور ان کی نظر میں نوع بشر کی تازہ عمر اس سے کم تھی کیوں کہ پہلے دنیا پیدا کی گئی اس کے بعد انسان وجود میں آیا۔

لیکن جب امام جعفر صادقؑ نے مثال دینا چاہی تو آپ نے دس ہزار سال کا حوالہ دیا' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ دنیا اور نوع بشر کے آغاز کے بارے میں عبرانی تقویم سے متفق نہیں اگرچہ کسی مثال کو دلیل نہیں سمجھنا چاہئے لیکن اس سے مثال دینے والے کے طرزِ فکر کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے اگر آپ کا عقیدہ یہ ہوتا کہ نوع بشر کی عمر چار ہزار سات سو سال سے زیادہ ہے تو دس ہزار سال کا ذکر نہ کرتے بلکہ اس سے کمتر مثلاً تین ہزار سال کو شاہدِ مثال قرار دیتے۔

ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پیدائشِ زمین کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کی معلومات اپنے ہم عصروں سے زیادہ تھیں کیوں کہ کبھی کبھی آپ سے ایسی باتیں

سننے میں آتی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ آغازِ خلقت کی نوعیت سے باخبر ہیں۔ ایک روز آپؑ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ تم پہاڑوں کے اوپر جو بڑے بڑے پتھر دیکھتے ہو یہ ابتدا میں پگھلے ہوئے مادے تھے جو سرد ہونے کے بعد اس شکل میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ساڑھے بارہ سو سال قبل پیش کئے جانے والے اس نظریئے کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے یہ بتانا کافی ہو گا کہ انقلابِ فرانس کے آغاز اور اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر تک یورپی دانشمند اس شک اور شبہ میں مبتلا تھے کہ آیا زمین ابتدا میں ایک پگھلا ہوا مادہ تھی یا نہیں؟ اور اس سے ایک صدی پہلے سارے یورپ میں کوئی ایسا دانشور موجود نہ تھا جو یہ کہہ سکے کہ شاید زمین اپنے آغاز میں ایک پگھلا ہوا مادہ تھی ان کا خیال تھا کہ زمین اسی شکل میں پیدا ہوئی جس میں آج ہم کو نظر آ رہی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے حصولِ علم میں انسانوں کی کاہلی کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ ایک حقیقت ہے۔ آج انسان شناسی کے ماہرین کہتے ہیں کہ جب سے نسلِ انسانی دو پاؤں پر چلنے کے قابل ہوئی ہے اس کو پانچ لاکھ سال ہوئے ہیں۔ اس سے قبل اس سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ یہ علوم کی جانب توجہ کر سکے کیوں کہ چار ہاتھ پاؤں پر چلنے کی وجہ سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انسان آلات اور اوزار بنا کے صنعت میں داخل ہو اور اس ذریعہ سے علوم تک پہنچے۔ البتہ پانچ یا چار لاکھ سال میں جب سے یہ دو پاؤں پر چلنے لگا اور اس کے دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے تو یہ آلات اور اوزار بنانے پر قادر ہوا اور گزشتہ ایک لاکھ سال میں اس نے آگ سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ بھی دریافت کر لیا۔ اگر ان ہی ایک لاکھ سال کے اندر اس نے علوم سے تعلق استوار کیا ہوتا تو آج زندگی کے سارے مسائل بلکہ شاید موت کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہوتا۔ لیکن ان ایک لاکھ برسوں میں علوم کی جانب انسانوں کی توجہ مجموعی طور پر پندرہ سو سال سے آگے نہیں بڑھی اور اس مختصر مدت میں بھی انسان کی یہ توجہ گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔

ایک چیز جو ہماری نظر میں ناقابلِ تردید معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ ڈکارٹ جس کے

دور کو تین صدیاں گزر رہی ہیں وہ پہلا شخص ہے جس نے جدید علمی تحقیق کی ابتداء کی اور کہا کہ علمی حقیقت تک پہنچنے کے لئے جسم کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنا چاہئے پھر ان کو اور بھی چھوٹے حصوں پر تقسیم کرنا چاہئے اور یہ سلسلہ قائم رکھنا چاہئے یہاں تک کہ سب سے چھوٹے جزو کو تقسیم نہ کیا جا سکے۔ اس کے بعد اس نے سب سے چھوٹے جسم پر تحقیق شروع کی۔ اس کے خواص کا پتہ لگایا اور دریافت کیا کہ طبیعیاتی اور کیمیائی لحاظ سے اس کی نوعیت کیا ہے اور اگر جسم کے سب سے چھوٹے جزو کے خواص معلوم کئے جا سکیں تو خود اس جسم کے خواص بھی دریافت کئے جا سکتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں علمی ارتقاء کا بہت بڑا حصہ ڈکارٹ کے اسی نظریئے کی پیداوار سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر اس نے یہ نظریہ پیش نہ کیا ہوتا تو اس قدر علمی پیش رفت نہ ہوتی۔ یہ جان لینا چاہئے کہ جس چیز نے ڈکارٹ کے نظریہ کو مقبولیت بخشی وہ ساتویں صدی عیسوی کے بعد ٹیکنالوجی اور صنعتوں کی توسیع تھی۔ ڈکارٹ سے بائیس سو سال قبل یونان کے حکیم ذیم قراطیس نے کلی طور پر یہ نظریہ پیش کیا تھا۔

البتہ امام جعفر صادقؑ نے ذیم قراطیس کے نظریہ کی تشریح و توضیح کی اور فرمایا کہ اشیاء کے خواص ہم پر اسی وقت بخوبی ظاہر ہوتے ہیں جب ہم کسی چیز کے چھوٹے حصے پر باریک بینی کے ساتھ تحقیق کریں اور اس کے خواص سے بڑے جسم کے خواص کا پتہ لگائیں۔ ہمارے لئے دنیا کے سمندروں اور دریاؤں کے سارے پانی کے بارے میں تحقیق ممکن نہیں ہے لیکن اگر اسی پانی کے ایک قطرے پر تحقیق کریں تو ہمیں جو کچھ معلوم ہو گا اس سے پورے دریا کے خواص کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر صنعت اور ایجادات میں اتنی پیش رفت نہ ہوتی اور جسموں کو چھوٹے سے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنے کے وسائل دانشوروں کی دسترس میں نہ آتے تو ذیم قراطیس اور امام جعفر صادقؑ کے اقوال کے مانند ڈکارٹ کا قول بھی تھیوری کی حدود سے آگے نہ بڑھتا۔

اگر آج ایک ملی میٹر کے دس لاکھویں حصے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے تو یہ صنعتی ترقی ہی کی وجہ سے ہے۔ ذیم قراطیس کے زمانے میں جو چیز آنکھوں سے دیکھی نہیں جا سکتی

تھی وہ ایٹم یا ناقابلِ تقسیم جزو تھا اور آج ایک ملی میٹر کا دس لاکھواں حصّہ بھی ناقابلِ تقسیم جزو نہیں ہے۔

امام جعفر صادقؑ سے جو دیگر سوالات کئے گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کسی کو عالمِ مطلق کہا جا سکتا ہے؟ اور انسان کس موقع پر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے ہر چیز سیکھ لی ہے؟

آپ نے فرمایا کہ تمہیں اس سوال کو دو حصّوں میں الگ الگ کر کے مجھ سے پوچھنا چاہئے۔ پہلا حصّہ جس کے متعلق سوال کر سکتے ہو یہ ہے کہ کس شخص کو عالمِ مطلق کہا جا سکتا ہے؟ تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ ذاتِ خدا کے علاوہ کوئی عالمِ مطلق موجود نہیں ہے اور کسی بشر کا عالمِ مطلق ہونا محال ہے کیوں کہ علم اس قدر وسیع ہے کہ کوئی شخص تمام دریافت طلب باتوں کو معلوم نہیں کر سکتا ' چاہے وہ ہزاروں سال زندہ رہے اور اس طولانی مدت میں مسلسل حصولِ علم میں مشغول رہے۔

ہو سکتا ہے وہ کئی ہزار سال کی عمر میں شاید اس دنیا کے جملہ علوم سے واقف ہو جائے لیکن اس دنیا کے علاوہ اور دنیائیں بھی ہیں اور ان میں بھی علوم موجود ہیں۔ اگر کوئی شخص اس دنیا کے سارے علوم سیکھ کے دوسری دنیاؤں میں پہنچے تو وہاں کے لئے جاہل ہو گا۔ اور اسے سرے سے علم حاصل کرنا ہو گا۔ تاکہ ان دنیاؤں کے علوم سے واقف ہو سکے۔ یہی سبب ہے کہ ذاتِ خدا کے علاوہ اور کوئی عالمِ مطلق نہیں ہے اس لئے کہ نوعِ بشر میں سے کوئی فرد بھی جملہ معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔

آپ کے شاگردوں نے سوال کا دوسرا حصّہ پیش کیا اور پوچھا کہ انسان کس موقع پر علم سے غنی ہو جاتا ہے؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب پہلے ہی جواب میں دیا جا چکا ہے اور میں کہہ چکا ہوں کہ اگر انسان ہزاروں سال کی عمر پائے اور برابر تحصیلِ علم میں مشغول رہے تب بھی سارے علوم کا احاطہ نہیں کر سکتا اس بنا پر کبھی بھی کوئی وقت ایسا نہیں آسکتا جب ایک شخص یہ محسوس کر سکے کہ وہ علم سے غنی ہے۔ صرف وہی

لوگ خود کو علم سے غنی محسوس کرتے ہیں جو جاہل ہیں۔ کیوں کہ جو شخص جاہل ہوتا ہے وہی خود کو علم سے بے نیاز جانتا ہے۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ دوسری دنیاؤں کے علم سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا کہ جس دنیا میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے علاوہ اور بھی ایسی دنیائیں موجود ہیں جو اس دنیا سے کافی بڑی ہیں اور اُس دنیا میں ایسے علوم ہیں جو یہاں کے علوم سے مختلف ہیں۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ دوسری دنیاؤں کی تعداد کتنی ہے تو جواب میں فرمایا کہ سوائے خدا کے اور کوئی ان کی تعداد سے واقف نہیں۔ پھر پوچھا گیا کہ دوسری دنیاؤں کے علوم اس دنیا کے علوم سے کس طرح مختلف ہیں؟ کیا علم سیکھنے کی چیز نہیں ہے؟ اور جو چیز سیکھنے کے لائق ہو وہ اس دنیا کے علوم سے مختلف کیوں کر شمار کی جا سکتی ہے؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ دوسری دنیاؤں میں دو طرح کے علم پائے جاتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو اس دنیا کے علوم سے مشابہ ہے اور اگر کوئی شخص یہاں سے وہاں جائے تو انہیں سیکھ سکتا ہے۔ لیکن بعض دنیاؤں میں ایسے علوم کی موجودگی کا امکان ہے جنھیں درک کرنے پر نوع انسانی کے دل و دماغ قادر نہیں ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کا یہ قول بعد میں پیدا ہونے والے دانشوروں کے لئے ایک معمہ بنا رہا۔ چنانچہ بعض اس کو قابلِ قبول نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ امام جعفر صادقؑ نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ لائقِ توجہ نہیں ہے۔ انہیں تردید کرنے والوں میں ابنِ راوندی اصفہانی بھی ہے۔ جس کا ذکر اس سے قبل آ چکا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ عقلِ انسانی ہر اس چیز کے ادراک پر قادر ہے جو علم ہو چاہے اس دنیا کے علوم ہوں چاہے دوسری دنیاؤں کے۔ لیکن امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے اپنے استاد کے قول کو تسلیم کیا اور اس بات کے قائل ہوئے کہ بعض دنیاؤں میں ایسے علوم موجود ہیں جنھیں افرادِ بشر حاصل نہیں کر سکتے کیوں کہ ہماری عقلیں انہیں سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں البتہ اس صدی میں جب آئین اسٹائین کی نسبیت کی تھیوری نے فزکس میں ایک بالکل جدید باب کا اضافہ کیا پھر اس کے بعد وجودِ ضد مادہ کی تھیوری نے تھیوری

کی حدود سے آگے بڑھ کے علم کے مرحلے میں قدم رکھا اور دانشوروں پر ثابت ہو گیا کہ مادے کی ضد موجود ہے تو آپ کا قول سمجھ میں آگیا۔کیوں کہ ضدِ مادہ کی دنیا کے طبیعیاتی قوانین ہماری دنیا کے طبیعیاتی قوانین سے مختلف ہیں اور اس سے بالا تر منطق و استدلال کے اصول و قواعد ان کے علاوہ ہیں جن کے وضع اور ادراک پر ہماری عقل قدرت رکھتی ہے۔ دنیائے ضدِ مادہ ایک ایسا عالم ہے جہاں ایٹموں کے اندر الیکٹرانوں کی قوت مثبت اور پروٹانوں کی قوت منفی ہے۔ لیکن ہماری دنیا میں الیکٹران کی قوت منفی اور پروٹان کی مثبت ہے۔

جس دنیا میں الیکٹران کی قوت مثبت اور پروٹان کی قوت منفی ہے، معلوم نہیں وہاں کن طبیعیاتی قوانین کی حکمرانی ہے۔ ہماری منطق اور استدلال میں کُل جزُ سے برتر ہے لیکن اس دنیا میں ممکن ہے کہ جزُ کُل سے برتر ہو اور ہمارا دماغ اس پر قادر نہیں ہے کہ اس موضوع کو سمجھے اور قبول کرے۔

ہماری دنیا میں جس وقت کسی وزنی جسم کو پانی میں ڈبویا جاتا ہے تو وہ ارشمیدس (Archimedes) کے اخذ کئے ہوئے قانون کے مطابق ہلکا ہو جاتا ہے لیکن اس دنیا میں اگر کسی جسم کو پانی یا کسی اور سیال میں ڈبو دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وزنی ہو جائے۔ پاسکل (Blaise Pascal) کے قانون کے مطابق جب کسی ظرف کے اندر ایک سیال شے کے کسی ایک نقطے پر دباؤ پڑتا ہے تو وہ دباؤ اس سیال کے تمام نقطوں پر پہنچتا ہے چنانچہ اسی قانون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وسائلِ نقل و حمل اور بالخصوص وزنی وسائلِ نقل و حمل کے لئے تیل کے بریک بنائے جاتے ہیں اور بریک کے پیڈل پر ڈرائیور کے پاؤں کے دباؤ سے جو تھوڑا سا دباؤ تیل کے اوپر پڑتا ہے وہ چونکہ تیل کے سارے نقاط اور اجزاء تک پہنچتا ہے لہٰذا اس سے ہزار گنا زیادہ دباؤ چلتے ہوئے پہیوں پر پڑتا ہے۔ اور انہیں دم بھر میں ساکن کر دیتا ہے۔ لیکن فزکس کا یہ قانون ممکن ہے دنیائے ضدِ مادہ میں موثر نہ ہو اور جو دباؤ سیال شے کے ایک نقطے پر پڑتا ہے وہ اس کے دوسرے نقطوں پر اثر انداز نہ ہوتا ہو اگر کوئی شخص اس دنیا سے دنیائے ضدِ مادہ میں

پہنچے تو ممکن ہے کہ وہاں کے فزیکی (طبیعیاتی) قوانین کے ساتھ جو اس کے لئے خلاف عادت و معمول ہیں' بتدریج مانوس ہو جائے جیسا کہ خلانورد خلائی راکٹوں میں زمین کے گرد گردش کرتے ہیں'یا چاند کے کرّے پر قدم رکھتے ہیں تو بے وزنی سے مانوس ہو جاتے ہیں کیوں کہ انہیں فضاء میں بھیجنے سے پہلے زمین ہی پر بے وزنی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عادی بنا دیا جاتا ہے۔

لیکن جن چیزوں کو آدمی دنیائے ضدِ مادہ میں قبول نہیں کر سکتا وہ ایسی چیزیں ہیں جو اس کے قوانینِ منطق و استدلال کے خلاف ہیں۔

اگر وہ اس دنیا میں جزؤ کو کلّ سے برتر پائے' اگر دیکھے کہ وہاں کے لوگ اعداد کے جمع و تفریق اور ضرب و تقسیم میں چار بنیادی عمل کے قواعد کا لحاظ نہیں رکھتے اور اگر محسوس کرے کہ وہاں حرارت پانی کو منجمد کر دیتی ہے اور برودت بھاپ بنا دیتی ہے بغیر اس کے کہ خلا کا کوئی وجود ہو تو وہ ان غیر عقلی مشاہدات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہی سبب ہے کہ اس دور میں امام جعفر صادقؑ کا یہ نظریہ کہ بعض دوسری دنیاؤں میں ایسے علوم بھی ہو سکتے ہیں جنھیں حاصل کرنے کی طاقت و صلاحیت انسان کے پاس نہیں ہے' قابلِ قبول نظر آتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ کے قول نے اس قدیم فلسفی بحث کو حیاتِ نو بخشی جو یونان میں علم کے بارے پیش کی گئی تھی۔ وہ بحث یہ ہے کہ آیا علم بذاتِ خود موجود ہے یا وہ ہے جو ہم استنباط کرتے ہیں یعنی طبیعی ہے؟

بعض یونانی دانشور کہتے ہیں کہ تنہا علم وجود نہیں رکھتا ہے۔ علم وہ چیز ہے جو ہم اشیاء اور حالات سے درک کرتے ہیں اور اس کے قواعد کے ذریعہ اس کا سراغ لگاتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ مادر زاد اندھا رنگوں کا علم حاصل نہیں کر سکتا اور مادر زاد بہرہ علمِ موسیقی کا ادراک کرنے پر قادر نہیں ہے۔

وہ کہتے تھے کہ صرف ایک یا دو ظاہری حواس کی کمی تمام علوم کے ادراک میں مانع نہیں ہے بلکہ حواسِ باطنی کی کمی بھی اس سے مانع ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک دیوانہ کسی قسم کا علم حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا چاہے اس کے ظاہری حواس میں کسی

طرح کا نقص نہ پایا جاتا ہے۔

اس گروہ کے مقابل یونانی دانشمندوں ہی کی ایک جماعت کہتی تھی کہ مجرد علم موجود ہے بقطع نظر اس سے کہ انسان اس کا ادراک کرے یا نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جو علم دنیا میں چار فصلوں کو وجود میں لاتا ہے ۔ وہ موجود ہے چاہے انسان ان فصلوں کا ادراک کرے یا نہیں اور جو علم سورج اور چاند کو زمین کے گرد حرکت دیتا ہے وہ اپنا وجود رکھتا ہے۔ خواہ انسان کے پاس آنکھ ہو اور وہ آفتاب و ماہتاب کو دیکھ سکے یا مادر زاد اندھا ہو اور ان کا مشاہدہ نہ کر سکتا ہو۔

ذیم قراطیس جو یہ کہتا ہے کہ دنیا ایٹم سے وجود میں آئی ہے' اس کا عقیدہ تھا کہ دو طرح کے علوم موجود ہیں ایک وہ جنھیں معلوم کیا جا سکتا ہے اور دوسرے وہ جن کے قواعد و جزئیات کا ادراک نہیں کیا جا سکتا ۔ ان مجہول علوم میں سے ایک ایٹموں کا علم ہے۔ اور دوسرے خداؤں کے علوم ہیں۔

ذیم قراطیس کے سو سال بعد اس پر اعتراض کیا گیا کہ جب اس نے یہ بتایا کہ ایٹموں کا علم مجہول ہے اور انسان اس کے قواعد و جزئیات کو دریافت کرنے سے قاصر ہے تو اس نے یہ کیوں کر کہا کہ دنیا ایٹموں سے وجود میں آئی ہے؟ کیوں کہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو ایٹم کے علم اور اس کے قواعد و جزئیات سے آگاہ ہو۔ خود ذیم قراطیس تو موجود نہ تھا جو اس کا جواب دیتا۔ البتہ اس کے عقیدت مندوں نے کہا کہ اس کی عقل کہتی تھی کہ دنیا ایٹموں سے وجود میں آئی ہے لیکن اس کے حواس اس پر قادر نہ تھے کہ وہ ایٹموں کا مشاہدہ کر سکے اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جنھیں آدمی اپنی عقل سے تو سمجھ سکتا ہے لیکن حواس کے ذریعے انہیں محسوس نہیں کر سکتا۔ ذیم قراطیس کے ماننے والے اپنے استاد کے مخالفین کو خاموش کرنے کا ایک موثر وسیلہ رکھتے تھے کہ خدا کو نہ حواسِ ظاہری سے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ سنا' اور نہ حواسِ باطنی کے ذریعے اس کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ جس طرح ہم حواسِ باطنی کے وسیلے سے اپنی بیماری کا پتہ لگا لیتے ہیں بغیر اس کے کہ اسے دیکھیں اور اس کی آواز سنیں۔

ذیم قراطیس بھی اپنی عقل کے ذریعے اس نکتے تک پہنچا کہ دنیا ایٹموں سے وجود میں آئی ہے۔ اور اگر وہ ایٹم کے علم کے قواعد اور جزئیات کو دریافت نہیں کر سکا تو اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔

ہمارے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ یونانی دانشوروں میں بھی ایسے لوگ تھے جن کا کہنا تھا کہ علوم دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کے ادراک پر بشری عقل قادر ہے۔ اور دوسرے وہ جو انسان کی دسترس سے باہر ہیں اور وہ اپنے شعور و عقل کے ذریعے ان تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

مندرجہ بالا بحث سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اوّل تو امام جعفر صادقؑ علم کو غیر محدود سمجھتے تھے اور دوسرے آپ کا عقیدہ تھا کہ کچھ علوم دوسری دنیاؤں میں ایسے ہیں جنہیں انسان عقل و شعور کے ذریعے درک نہیں کر سکتا جیسے اس دنیا میں تحصیلِ علم کرتا ہے۔ آج آئین اسٹائین کی نسبیت کی تھیوری اور نظریۂ ضدِ مادہ کے بعد جس کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ تھیوری کی حدود سے گزر کے علمی مرحلے میں داخل ہو چکا ہے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ساڑھے بارہ سو سال قبل امام جعفر صادقؑ نے ایک صحیح نظریہ پیش کیا تھا۔

عباسی دور کا ایک مشہور و معروف مورخ جس نے امام جعفر صادقؑ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ابن ابی الحدید ہے جس کی موت عباسی خلافت کا دور ختم ہونے سے ایک سال قبل ۶۵۵ھ میں ستریا ساٹھ سال کے سن میں ہلاکو خان کے ہاتھوں ہوئی اور اس کا نام عزالدین عبدالحمید ابن محمد تھا یہ کہتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کی وفات کے بعد تقریباً ڈیڑھ یا دو سو سال کی مدت تک عربستان بین النہرین ' عراق و عجم و خراسان اور ایران میں جو مدّرس درس دیتا تھا وہ امام جعفر صادقؑ سے سند لینے کی کوشش کرتا تھا کہ امام جعفر صادقؑ سے اس طرح منقول ہے۔ پھر یہی مورخ کہتا ہے کہ اہلسنّت والجماعت کے فرقوں کے مدّرسین بھی درس دیتے وقت آپ سے روایت نقل کرتے تھے۔

ایک روز بنی عباس کے آخری وزیر ابن علقمی نے ابن ابی الحدید سے پوچھا کہ گزشتہ دور میں عالمِ اسلام کا سب سے بلند پایہ عالم اور دانشمند کون تھا تو اس نے جواب دیا کہ امام جعفر صادقؑ۔

چونکہ امام جعفر صادقؑ کو سب سے بڑا اسلامی دانشور مانا گیا ہے لہٰذا ایک محقق چاہتا ہے کہ آپ کے معیارِ علم (میزانِ معلومات) سے واقفیت حاصل کرے۔

شیعہ مورّخین کی کتابوں میں امام جعفر صادقؑ کے علوم کا شمار ایک سو سے پانچ سو تک کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ شیعہ مورّخین کی ایک جماعت نے جس قدر آپ کے معجزات کے بارے میں لکھا ہے اس قدر آپ کے علوم کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔

شیعہ مورخین آپ کے اعجاز پر جو عقیدہ رکھتے تھے اس کی بنا پر ایران کے ایک گروہ کی کتابوں میں آپ کی سوانح کو آپ کے معجزات ہی کے ذیل میں لکھا گیا ہے اور ان کی بعض کتابوں میں تو آپ کے معجزات کی تفصیل سے کافی صفحات بھرے ہوئے ہیں۔

شیعہ مورخین کی ایک جماعت کی کتابوں میں معجزات کے شمار سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً کوئی ایسا دن نہیں گزرتا تھا جس میں امام جعفر صادقؑ سے کوئی معجزہ رونما نہ ہوتا ہو۔

امام جعفر صادقؑ کے معجزات کا ایک حصّہ صفوی دور کے بہت بڑے عالم و فاضل علامہ مجلسیؒ کی کتاب بحار الانوار میں بھی درج ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں مجلسی نے جو کچھ بھی بحار الانوار میں لکھا ہے وہ دوسرے منابع سے اقتباس ہے۔

امام جعفر صادقؑ کے معجزات کی تفصیل بیان کرنے والے شیعہ مورخین میں سے ایک ابو جعفر ابن بابویہ قمی ہیں یہ بزرگ جنھوں نے بہت مشہور کتاب مَن لا یحضرہ الفقیہ لکھی، شیعوں کے بڑے علماء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اور ان کا دورِ حیات چوتھی صدی ہجری تھا جو زمانے کے لحاظ سے امام جعفر صادقؑ کے قریب تھا۔

ابن بابویہ قمی نے معجزاتِ امام جعفر صادقؑ کے علاوہ اپنی ایک خاص کتاب "عیون اخبار الرضا" میں آپ کے پوتے امام علی ابن موسیٰؑ ابن جعفرؑ کے معجزات بھی

بیان کیے ہیں۔

چونکہ شیعہ مورخین امام جعفرصادقؑ کے لئے امامت کے قائل تھے لہٰذا ہم جیسا کہ پہلے بتا چکے ہیں ان میں سے بعض نے آپ کے علوم کی تعداد پانچ سو قرار دی ہے، بغیر اس کے کہ ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ ذکر کریں۔

البتہ ایک تاریخی محقق جب یہ دیکھتا ہے کہ آپ پانچ سو علوم سے واقفیت رکھتے تھے اور ان سب کا درس دیتے تھے تو اس بات کو تسلیم نہیں کرپاتا کہ ایک انسان اتنے علوم کا حامل ہو گا۔

بے شک امام جعفرصادقؑ کے عہد میں علوم کی تعداد آج کی مانند نہ تھی اور آگاہی میں آج کی سی تیز رفتاری کے ساتھ اضافہ نہیں ہوا تھا اور ہنر کی وسعت اس بات کا سبب نہ بنی تھی کہ ایک کوتاہ مدت میں ایک علم سے دوسرے علوم وجود میں آجائیں۔

مثلاً ایٹم شناسی کے علم نے ایک قلیل مدت (۱۹۴۰ سے ۱۹۷۰ء) میں اس قدر وسعت اختیار کرلی ہے کہ آج ایک شخص نظری اور عملی لحاظ سے مکمل طور پر ایٹم شناس نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی ناکافی عمر اس سلسلہ میں رکاوٹ ہے کہ وہ عملی اور نظری ہر دو لحاظ سے ایٹم شناسی کا ماہر ہوجائے۔ اگر وہ ایٹم شناسی کے نظری شعبہ کو پیشِ نظر رکھے گا تو عملی شعبہ اس سے رہ جائے گا اور اسی طرح اگر وہ عملی شعبہ کی جانب قدم بڑھائے گا تو نظری شعبہ میں پیچھے رہ جائے گا۔

اسی مثال کو ہم جنگی مسائل میں بھی لے سکتے ہیں۔ امریکہ میں ہوائی جنگ کے حوالے سے ایک نئی ٹیکنیک وجود میں آئی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے جنگی جہاز کو بغیر ہواباز کے اڑانا شروع کردیا ہے اور اس ٹیکنیک کی دریافت نے فضائی جنگ کی ٹیکنیک کو بدل دیا ہے اور فضائی جنگ میں ایک نئی ٹیکنیک دریافت کی ہے۔

لیکن ماضی میں ایسا نہ تھا اور علم و صنعت اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ تغیر سے دوچار نہ تھے۔ آج کے دور میں شاید اصلی اور فرعی علوم کی تعداد ایک ہزار سے تجاوز کرچکی ہو لیکن ساڑھے بارہ سو سال قبل علوم کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہ تھی۔

شیعہ مورخین نے یہ جو کہا ہے کہ امام جعفر صادقؑ پانچ سو علوم سے واقف تھے اور ہر ایک کی تدریس کرتے تھے' یہ مندرجہ ذیل دو عوامل کی بناء پر ہے۔

اوّل یہ کہ ان کا مذہبی عقیدہ تھا کہ امام جعفر صادقؑ امام ہیں اور شیعہ عقیدہ کے مطابق امامؑ اس کائنات میں دانائے مطلق ہے۔ یاد رہے کہ ان کی نظر میں علمِ مطلق دو نوع رکھتا ہے۔

ایک علمِ مطلقِ خداوند اور دوسرا علمِ مطلقِ پیغمبرؐ کہ جو آنحضرتؐ کے بعد امام کو حاصل ہوتا ہے۔

خداوندِ عالم کے علم کے بارے میں وہ کسی حد کے قائل نہیں اور اسے علمِ مطلق سمجھتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس کا علم خود اس کی مانند لامحدود ہے اور خداوندِ عالم کا علم اس کی ذات سے جدا نہیں کہ اسے اکتسابی سمجھا جائے۔

تمام مسلمان' خداوندِ عالم کی تمام صفات کو بشمول اس کے علم کو اسؒ کی ذات کا جزو سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خداوندِ عالم کوئی مبداء و منتہا اور آغاز و انجام نہیں رکھتا اور اس کا علم بھی ابتداء و انتہا اور حدود کا حامل نہیں۔

کیا خداوندِ عالم جانتا ہے کہ اس کا کوئی آغاز و انجام نہیں اور کیا آگاہ ہے کہ وہ ازلی و ابدی ہے؟

مسلمان کا جواب ہے ہاں!

معترض کہتا ہے کہ اگر خدا جانتا ہے کہ آغاز نہیں رکھتا اور نہ ہی انجام کا حامل ہے تو اس نے خود کو کیسے پہچانا ہے؟ آیا شناسائی کے لئے لازم نہیں کہ مبداء اور منتہا سے واقف ہو؟

جواب ہے کہ جو علمِ مطلق ہو عین اس حال میں کہ جانتا ہے کہ اس کی مبداء و منتہا نہیں خود کو پہچانتا ہے کیونکہ علمِ مطلق ہماری کسی منطق کے قواعد کے قالب میں محدود نہیں ہوتا اور علمِ مطلق کہ جس کا مواد توانائیِ مطلق ہے اس قدر بسیط ہے کہ اس کو منطقی قواعد کے احاطہ اور نوعِ بشر کے استدلال میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔

شیعہ جس دوسرے علمِ مطلق کے قائل ہیں وہ ہے پیغمبرؐ اور امامؑ کا علم۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کے علم کی حدود ان وظائف و ذمہ داریوں سے کہ جن کا خدا کی طرف سے ان کے لئے تعین ہوا ہے تجاوز نہیں کرتی ہیں اور دوسرے یہ کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کے علم کا پیمانہ خداوندِ عالم کے علمِ مطلق کے جیسا نہیں ہے۔

شیعوں کے درمیان ایسے عرفاء پیدا ہوئے جن کا کہنا ہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کا علم خداوندِ عالم کے علم جیسا ہو سکتا ہے اور علم اور اس کے نتیجہ میں توانائی کے لحاظ سے خدا اور پیغمبرؐ اور امامؑ کے مابین کوئی فرق نہیں۔

لیکن شیعہ علماء نے کسی دور میں عرفاء کے اس نظریہ کو قبول نہیں کیا اور ہمیشہ خداوندِ عالم ہی کو خالق و عالمِ مطلق سمجھا ہے اور پیغمبرؐ اور امامؑ کو خداوندِ عالم کی مخلوق اور اس دنیا میں یعنی خداوندِ عالم کی خاص حدود کہ جس تک کسی اور کی فکر نہیں پہنچ سکتی کے سوا عالمِ مطلق سمجھا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ شیعہ علماء ہر دور میں اس بات کے معتقد رہے ہیں کہ امام اس دنیا میں یعنی خداوندِ عالم کے لئے مخصوص حدود کے سوا علمِ مطلق کا حامل ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو امامؑ نہ جانتا ہو اور نہ کر سکتا ہو علاوہ ان چیزوں کے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ وہ شیعہ مورخین جو امام جعفر صادقؑ کو پانچ سو علوم کا حامل سمجھتے ہیں پہلے مرحلے میں اسی مذہبی عقیدہ کے زیر اثر رہے ہیں۔

دوسرا عامل جس نے انہیں اپنے زیرِ اثر لیا وہ امام جعفر صادقؑ کا نبوغِ علمی تھا کیونکہ انہوں نے علوم کے بارے میں امام جعفر صادقؑ سے جو کچھ سنا تھا وہ ثابت کرتا تھا کہ آپؑ علمی میدان میں ایک غیر معمولی ہستی ہیں اور جن مورخین نے آپ کے علمی تبحر کو دیکھا تھا وہ سمجھتے تھے کہ ایسی ہستی تمام علوم کی مالک ہے اور کیونکہ امام محمد باقرؑ سے حدیث بھی نقل ہوئی کہ "علوم کی تعداد پانچ سو ہے" لہٰذا بعض شیعہ مورخین نے تحریر کیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ پانچ سو علوم جانتے اور ان کی تدریس کرتے تھے۔

ماضی میں دانشوروں کا طبقہ علم کی تقسیم کے بارے میں آج سے کہیں زیادہ سخی تھا

اور ہر علم کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

علمِ اعداد جو آج ایک علم ہے دورِ قدیم میں آٹھ علوم میں تقسیم ہوگیا تھا۔ اور عبارت تھا، جمع، تفریق، ضرب، تقسیم، جذر، کعب، تصاعد، جبر و مقابلہ۔ آج اس سب کو علمِ حساب کہا جاتا ہے اور لوگار تھم اور ٹرگنومیٹری اور حسابِ عالی بھی حساب ہی کا جزو ہوگئے ہیں اور سب کو ایک ہی علم شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح علومِ ادب میں، علم کے ہر جز کو ایک علم شمار کیا جاتا تھا۔ بحر کی شناخت ایک علم تھا اور قافیہ کی شناختِ ایک اور علم اسم اولیٰ کو (علم بحور) رکھا گیا تھا اور دوسرے نام کو (علم قوافی)

بعض قدیم شعراء کسی ایک عرب شاعر کے تمام قصائد کو یاد کرنے کو بھی علم کہتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی عرب کے مشہور شاعر اعشیٰ کے پانچ قصائد یاد کرلیتا تو دعویٰ کرتا کہ پانچ علوم کا حامل ہے۔

اس تقسیم بندی کے ساتھ تصدیق کی جاسکتی ہے کہ بعض شیعہ مورخین کے بقول امام جعفر صادقؑ پانچ سو علوم کو جانتے تھے اور ان کی تدریس کرتے تھے لیکن علم کی اس تعریف کے مطابق جو آج کا ذوقِ سلیم کرتا ہے یہ بات قابلِ قبول نہیں کہ (اگر صرف انسانی لحاظ سے فیصلہ کیا جائے) جعفر صادقؑ پانچ سو علوم کے حامل تھے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ آج ایک علم ممکن ہے کئی فروعات کا حامل ہو جن میں سے ہر ایک علم شمار ہو۔ طب کا علم دسیوں فروعی علوم میں تقسیم ہے جس میں سے ہر ایک جداگانہ ہوتے ہوئے بھی دوسرے طبی علوم سے ربط رکھتا ہے۔

علمِ طب کا ایک شعبہ سرطان شناسی ہے کہ جو بہت وسعت اختیار کرگیا ہے لیکن جو سرطان شناس ہو اسے لازماً طب کے دیگر شعبوں مثلاً قلب شناسی، گردش خون (Blood Pressure) اور علمِ اعصاب کے بارے میں کلّیات سے واقف ہونا چاہئے کیونکہ انسانی بدن کے تمام حصے انسانی اعضاء کے کاموں کے اعتبار سے باہم وابستہ ہیں اور جب کوئی سرطان کی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے خون کی گردش اور اعصاب پر بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ارتباط کم و بیش دوسرے فرعی علوم میں بھی پایا جاتا

ہے۔

شیعہ علماء نے اسی دوسری صدی ہجری میں کہ جو امام جعفر صادقؑ کی صدی تھی آپؑ کے علوم کو دو بڑے طبقوں میں تقسیم کردیا تھا اور یہ طبقہ بندی اب تک موجود ہے۔

ان دو طبقوں میں سے ایک معقول ہے اور دوسرا منقول۔

آج علم کو ان شکلوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ علم منقول کو اس دور میں قبول نہیں کیا جاسکتا سوائے اس کے کہ ادب کو علم میں شمار کیا جائے۔

ادب کی گزشتہ انواع میں سے اب کوئی علم منقول پہلو کا حامل نہیں اور حتیٰ علم تاریخ مکمل طور پر منقول نہیں اور آج کا مورخ محض تاریخ کے اس حصے کو منقول سمجھتا ہے کہ جس پر عقلی لحاظ سے اظہار نظر نہیں کرسکتا۔

---☆---☆---

تاریخ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں

شیکسپیئر کے اشعار جو ادب کا جزو ہیں انہیں اسی صورت سے قبول کرنا چاہئے کیونکہ ایک منقول علم ہے لیکن آج کا مورّخ جنگِ واٹر لو کی تفصیلات کو منقول نہیں جانتا ہے۔ کیونکہ انہیں سمجھنے کے لئے عقل سے کام لیتا ہے جس طرح امام جعفر صادقؑ ساڑھے بارہ سو سال پہلے تاریخ کی تحقیق میں عقل استعمال کرتے تھے لہٰذا آپ تاریخ پر نقد و تبصرہ کے لحاظ سے آج کے مورّخ سے مختلف نہ تھے۔

یونانی مورّخ "ہروڈوٹ" نے اپنی تاریخ کے ایک مقدمے میں لکھا ہے کہ جس چیز کو عقل قبول نہیں کرتی میں بھی اسے قبول نہیں کرتا۔ حالانکہ اس تاریخ میں بھی خلافِ عقل اضافے پائے جاتے ہیں۔

اسلام میں امام جعفر صادقؑ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخی روایات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور نشاندہی کی ہے کہ انہیں بغیر غور و فکر اور نقد و تبصرہ کے تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔ یہ آپ ہی تھے جو تاریخ لکھنے میں (ابن جریر طبری) کے استاد اور مربّی بنے اور جب ابن جریر طبری نے تاریخ نویسی کے لئے قلم اٹھایا تو اسے آپ ہی کی وجہ سے معلوم ہوا کہ وہی چیزیں لکھنا چاہئیں جنہیں عقل قبول کرلے اور ایسے افسانوں سے اجتناب برتنا چاہئے جنہیں سن کر لوگوں کو نیند آنے لگے۔

امام جعفر صادقؑ سے قبل مشرق وسطیٰ میں تاریخ ایک ایسی چیز تھی جس کے بہت

سے حصے افسانوں کی حیثیت رکھتے تھے کیونکہ جو لوگ تاریخ سنتے یا پڑھتے تھے وہ اس کے افسانوں کو تسلیم کرتے تھے۔

ایک احتمال کے مطابق اسلام سے قبل ایران میں تاریخ اور تاریخی کتابیں موجود تھیں جن کا ایک صفحہ بھی آج دستیاب نہیں ہے۔

ہخامنشیوں اور ہاسانیوں کے جو مکتوبات دستیاب ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ایران میں یہ اصول رائج تھا کہ واقعات کو ضبطِ تحریر میں لاتے وقت قصّوں اور افسانوں کو تاریخ میں داخل نہیں کیا جاتا تھا۔

ہخامنشیوں اور ساسانیوں کے دور کے جو مکتوبات باقی رہ گئے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو قصّے کہانیاں بیان کرتا ہو بلکہ ان میں معتبر واقعات درج ہوئے ہیں البتہ اُن کے اندر اِن کے بادشاہوں کے مذہبی اثرات ضرور جھلک رہے ہیں،جن کے حکم سے یہ لکھے گئے ہیں۔ اگر قدیم ایران میں اس عقلِ سلیم اور حسنِ تشخیص کا وجود نہ ہوتا کہ تاریخ میں قصّے کہانی کا دخل نہیں ہونا چاہئے تو کم ازکم کسی ایک ہی باقی ماندہ تحریر میں کوئی افسانوی چیز نظر آتی۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مکتوبات چونکہ مختصر تھے لہٰذا ان میں اس کی گنجائش ہی نہ تھی کیونکہ ہخامنشی بادشاہ دار یوش اوّل کا مکتوب بہتون (بہستان۔ بیتون) اور ساسانی بادشاہ شاپور اوّل کا نقشِ رستم دونوں چھوٹے مکتوب ہیں اگر چاہتے تو ان میں افسانوں کا اضافہ کرسکتے تھے لیکن سوائے تاریخ کے اور کچھ درج نہیں کیا۔ بہرحال چونکہ ایران میں قبلِ اسلام کی تاریخ کی کتابیں باقی نہیں ہیں لہٰذا نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں افسانوں کا وجود تھا یا نہیں۔(۱)

۱۔ خدائی نامہ جو شاہنامہ فردوسی کا ماخذ بنا ایک روایت کے مطابق ساسانیوں کے دور میں لکھا گیا اور ہمیں معلوم ہے کہ اس میں صرف قصے کہانیاں ہی تھیں۔ اس کے تاریخی افسانے ایک روایت کے مطابق اشکانیوں کے زمانے میں مرتب ہوئے۔ (فارسی مترجم)

دوسری صدی ہجری کے نیمۂ اوّل میں جو امام جعفر صادقؑ کا زمانہ کہا جاتا ہے افسانہ اور تاریخ باہم مخلوط تھے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ دوسری صدی ہجری کا نیمۂ اوّل اسلام میں کتاب کے وجود میں آنے کا ابتدائی زمانہ ہے اور اس دور میں عربوں نے اپنے افکار کو قلمبند کرنے کے لئے نثر سے کام لیا۔ اس لئے کہ شبہ پیدا نہ ہو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس سے قبل عربوں میں نثر کا وجود ہی نہ تھا البتہ شاذو نادر تھا اور دوسری صدی ہجری کے نیمۂ اوّل میں عربی زبان میں نثر کے مختلف نمونے اس طرح سے سامنے آئے جیسے فصلِ بہار میں گل وبوٹے یک بیک نمو پاتے ہیں۔ ان میں بیشتر کتابیں آج باقی نہیں ہیں اور انہیں جنگوں، زلزلوں اور سیلابوں وغیرہ نے نابود کردیا ہے۔ لیکن ابن الندیم وراق کے طفیل ہم ان کے ناموں اور لکھنے والوں سے واقف ہیں نیز یہ کہ ان میں تاریخی کتابیں بھی تھیں لیکن تاریخ اس طرح لکھی جاتی تھی کہ افسانوں سے پاک نہیں ہوتی تھی۔

امام جعفر صادقؑ کسی ایسی کتاب کی تاریخی قدر و قیمت کے قائل نہیں تھے جس میں افسانوں کی آمیزش نظر آتی تھی۔ آپ کہتے تھے کہ افسانہ اور کہانی گمراہ کرتی ہے لہٰذا اسے تاریخ میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔ اسی بناء پر آپ نے سب سے پہلے اسلام کی تاریخ پر نقد و تبصرہ کو رواج دیا اور بقول ابنِ ابی الحدید جس کو اسلام میں تاریخ اور فرانسیسی زبان میں "ہیستوار" کہتے ہیں سب سے پہلے امام جعفر صادقؑ نے وضع کیا۔

تاریخ کا لفظ عربی زبان میں تھا لیکن جس کتاب کو فرانسیسی زبان میں "ہیستوار" کے عمومی نام سے یاد کیا جاتا تھا، اس پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

اسلام سے قبل عربوں کے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جس کا فن کے لحاظ سے تاریخ نام رکھتے۔ ان کی تاریخی روائتیں ہمیشہ اشعار کے قالب میں ڈھلتی تھیں۔ شعراء انہیں پڑھتے تھے اور سامعین یاد رکھتے تھے۔

اسلام کے بعد جب عربوں میں کتاب نویسی شروع ہوئی اور انہوں نے تاریخ کی کتابیں لکھیں تو ان کا عمومی نام تاریخ نہیں رکھا بلکہ انہیں روایت کہتے تھے کہا جاتا ہے

کہ "دساتیر" کے نام سے جو تاریخ فارسی میں لکھی گئی وہ بھی اسی دور میں فارسی دری زبان میں تحریر ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ آیا دوسری صدی ہجری میں دری زبان اس قدر وسعت حاصل کر چکی تھی کہ اس میں دساتیر جیسی کتاب لکھی جائے؟ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ محققین کی ایک جماعت دساتیر کو ایک جعلی تاریخ سمجھتی ہے جو صفوی دور میں وضع کی گئی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے افسانے اور تاریخ کے سلسلے میں ایک ایسا نکتہ بیان کیا ہے جو نشاندہی کرتا ہے کہ آپ نے کم از کم اسلام میں تاریخ کو اجتماعی حیثیت سے فائدہ پہنچایا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ جب تاریخ میں افسانہ شامل ہوجاتا ہے تو اس سے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

تاریخ سے واقفیت اس لحاظ سے مفید ہے کہ آنے والی نسلیں اسلاف کے حالات و واقعات سے نصیحت حاصل کریں اور جو کام نقصان دہ نظر آئیں ان سے پرہیز کریں۔

آج تاریخ کا سب سے بڑا فائدہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ آنے والے گزرے ہوئے لوگوں کے واقعات سے سبق حاصل کرتے ہیں اور ان کاموں کی طرف قدم نہیں بڑھاتے جنہوں نے اسلاف کو برباد کیا تاکہ ان کی طرح یہ بھی برباد نہ ہوں۔

اس زمانے میں آسٹریا کا مشہور فلسفی "فرائیڈ" جو روحانی امراض کا معالج بھی تھا تاریخ کے اس بڑے فائدے کی تصدیق کرتا تھا۔ البتہ کہتا تھا کہ بشری جذبات تاریخ سے عبرت حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک جذبہ خود غرضی کا ہوتا ہے اور خود غرضی انسان کو اس بات کی تلقین کرتی ہے کہ جو افتاد اسلاف کے اوپر آئی اور انہیں برباد کیا وہ اس پر وارد نہ ہوگی کیونکہ یہ دوسرے زمانے میں زندگی بسر کررہا ہے اور اپنے اسلاف کے مقابلے میں زیادہ ہوشمند، ماہر اور طاقتور ہے۔

یہاں تک کہ اگر خود غرضی نہ ہو تب بھی بقول فرائیڈ دوسرے جذبات تاریخ سے

نصیحت حاصل کرنے میں حائل ہوتے ہیں۔ بہرحال افسانے کو تاریخ سے دور کرنے کے بارے میں امام جعفر صادقؑ نے جو کچھ فرمایا ہے اس نے اسلام میں تاریخ پر نقد و تبصرے کے مؤقف کو مستحکم بنایا اور علمِ تاریخ کو وجود بخشا۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے بتایا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے بعض علوم اپنے والد امام محمد باقرؑ سے حاصل کئے لیکن بہت سے علوم جن کی آپ اپنی درسگاہ میں تعلیم دیتے تھے ایسے تھے جنہیں آپ خود اپنی تحقیق سے حاصل کرتے تھے۔ منجملہ ان کے یہ مسئلہ ہے کہ خاک بسیط نہیں ہے اور ہوا بھی بسیط نہیں ہوتی اور یہ وہ معلومات تھیں جنہیں خود امام جعفر صادقؑ نے دریافت کیا اور اپنے شاگردوں کو ان کی تعلیم دی۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس بات کا پتہ لگایا کہ ہوا میں ایک ایسی شے موجود ہے جو آگ جلانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اور وہی چیز دھاتوں کے فاسد ہونے کا باعث بنتی ہے۔

ہم نے امام جعفر صادقؑ کا یہ قول بھی پڑھا ہے کہ دوسری دنیاؤں میں دو طرح کے علم موجود ہیں ایک وہ جسے ہم اپنی عقل سے حاصل کرتے ہیں اور دوسرے وہ جسے شاید عقل سے سمجھنا ممکن نہ ہو۔ آپ ہی نے یہ بھی بتایا ہے کہ غالباً دوسری دنیاؤں سے ایسے علوم کے حامل جنہیں ہم نہیں جانتے' اس کوشش میں ہیں کہ ہمارے ساتھ رابطہ قائم کریں لیکن چونکہ ہم ان کے علم سے آگاہ نہیں ہیں اور ان کی زبان کو نہیں سمجھتے' لہٰذا ابھی تک نہیں جانتے کہ وہ ہم سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کی نظر میں دوسری دنیاؤں کے موجودات حقیقی اور واقعی چیزیں ہیں کیونکہ قرآن مجید میں اِنس یعنی نوع بشر کے ساتھ ساتھ جِن کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ یعنی وہ موجودات جو نظر نہیں آتے۔ یہاں تک کہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا جب تمام انسان اور وہ موجودات جو نظر نہیں آتے ایک جگہ اکٹھا ہوں گے اور ایک ہی جماعت یا گروہ کی صورت میں جمع ہوں گے۔ لیکن امام جعفر صادقؑ سے قبل ان مخلوقات کے علوم کے بارے میں جو نگاہوں سے پوشیدہ ہیں یا دوسری دنیاؤں کے

موجودات ہیں اور یہ کہ ممکن ہے وہ انسانوں سے رابطہ کرنا چاہتے ہوں لیکن انسان ان کی زبان نہیں سمجھتا' کچھ نہیں کہا گیا اور آپ کے بعد بھی انیسویں صدی عیسوی تک کسی نے اس موضوع پر کوئی ایسی بات نہیں کی جو قابلِ توجہ ہو۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی میں فرانس کے کامیل فلا ماریون نے اس موضوع پر گفتگو کی اور نوع انسانی کے ساتھ دوسری دنیاؤں یعنی آسمانی کروں کے باشندوں کے ساتھ رابطے کے بارے میں بغیر کسی تجربے کے چند نظریئے پیش کئے کیونکہ اس وقت تک ٹیکنیک اس حد تک آگے نہیں بڑھ سکی تھی کہ وہ تجربے کے مرحلے میں داخل ہو سکتا۔

تجرباتی حیثیت سے ۱۹۲۰ء میں پہلی بار معلوم ہوا کہ دیگر دنیاؤں کے باشندے زمین والوں سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی سال اٹلی کا "مارکونی" عملی طور پر وائرلیس سے کام لینے والا پہلا شخص ہے۔ اٹلی کی بحری فوج کے افسران کی ایک میٹنگ میں جو اٹلی کے امیر البحر "کاونٹ میلو" کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی اس نے کہا کہ میں اپنے جہاز کے وائرلیس اسٹیشن پر کچھ لہریں وصول کر رہا ہوں جنہیں بلاشبہ کوئی ہوشمند اور صاحبِ علم و فن مخلوق کرۂ زمین پر بسنے والوں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے بھیج رہی ہے۔(۱۹۷۲ء میں امریکہ کے ہفتہ وار رسالے "ٹائم" نے جو علمی مقالات کو سلسلہ وار شائع نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے تمام علمی مقالے ایک ہی شمارے میں مکمل ہوجاتے تھے کئی شماروں میں چند علمی مقالے شائع کئے جن کا بڑا حصہ دوسری دنیاؤں کے باشندوں کے ساتھ ارتباط کے بارے میں تھا اور اس رسالے نے زیادہ تر ان تجربات پر تکیہ کیا جو اب سوویت یونین میں دوسرے کروں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے عمل میں آتے ہیں۔ اس نے کہا کہ روسی سائنس دان جو ریڈیو ٹیلی اسکوپوں کے ذریعے تجربات میں مشغول ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں رکھتے کہ دیگر کروں سے جو نظامِ شمسی سے باہر واقع ہیں اس دنیا کی باشعور مخلوقات کے لئے کچھ پیغامات بھیجے جاتے ہیں جنہیں زمین کے ریڈیو ٹیلی اسکوپ بھی وصول کرتے ہیں۔ البتہ ان پیغامات کا جواب دینے اور اس کے بعد دوسری دنیاؤں کے بافہم موجودات کی طرف سے جواب الجواب حاصل کرنے میں بقول

رسالہ "ٹائم" ایک زمانی مشکل ہے اور یہ کہ ہمارے لئے پیغام بھیجنے والی سب سے نزدیک دنیا بھی ہم سے ایک سو نوری سال کے فاصلے پر ہے لہٰذا روسی سائنس دان اگر آج اس کے پیغام کا جواب روانہ کریں تو یہ سو سال گزرنے کے بعد زمین کے نزدیک ترین ہمسائے تک پہنچ سکے گا اور پھر مزید ایک سو سال تک انتظار کرنا پڑے گا تاکہ اس کا جواب ہمارے یہاں موصول ہوسکے اور بقول مجلّہ "ٹائم" بعض پیغامات تو ایسی دنیاؤں سے آرہے ہیں جن کا فاصلہ زمین سے اس قدر زیادہ ہے کہ جس وقت ان کے پیغامات چلے ہوں گے شاید اس وقت تک کرۂ زمین پر بڑے جاندار بھی وجود میں نہ آئے ہوں' انسان کا تو ذکر ہی کیا؟

رسالہ "ٹائم" نے اپنے سلسلہ وار مقالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ انسانوں نے پہلی بار جب اپنے تجربے سے دریافت کیا کہ دوسری دنیاؤں میں بھی باشعور مخلوق موجود ہے تو ایسا ۱۹۲۰ء میں اٹلی کے مارکونی کے ذریعے عمل میں آیا اور اسی بناء پر امیر البحر کاونٹ میلو کی لڑکی نے مجلّہ ٹائم کو ایک خط لکھا جو اس کے ۲۱ مئی ۱۹۷۳ء کے شمارے میں چھپا ہے اور وہ لڑکی آج مکمل عورت ہے' اس نے کہا ہے کہ وہ خود گواہ ہے کہ مارکونی نے اس کے باپ امیر البحر میلو سے کہا تھا کہ وہ اپنے جہاز "الترکوا" کے وائرلیس اسٹیشن پر دیگر دنیاؤں کے پیغامات وصول کرتا ہے

مارکونی بھی اپنے تجربے کو وسعت نہ دے سکا کیونکہ ابھی ریڈیو ٹیلی اسکوپ کی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور معمولی نوری ٹیلی اسکوپوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ نظامِ شمسی سے باہر کے کروں کا بخوبی مشاہدہ کرسکیں دوسرے یہ کہ معمولی ٹیلی اسکوپ ۱۹۲۰ء میں کمزور تھے اور اس وقت تک امریکہ کے کوہ "پالومر" کے اوپر قائم رصد گاہ کے ٹیلی اسکوپ کی بڑی دوربین جس کا قطر پانچ میٹر ہے نہیں بنی تھی کہ اس کے ذریعے ان کہکشانوں کا جو زمین سے دو ہزار ملین نوری سال کے فاصلے پر ہیں معائنہ کیا جاتا۔ (۱)

ا۔ اس دوربین کی تیاری ۱۹۳۶ء سے شروع ہوئی اور جب اس کا پگھلا ہوا مادہ بھٹی سے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اس ٹیلی اسکوپ کے کام کے آغاز کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے ذریعے دوسری دنیاؤں میں رہنے والوں سے رابطہ قائم کرنے کا مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا' کوہ پالومرکی رصدگاہ کا یہ نوری ٹیلی اسکوپ اگرچہ کہکشانوں کو دیکھتا تھا جن کا فاصلہ زمین سے دو ہزار ملین (دو ارب) نوری سال ہے لیکن انہیں آسمان میں ایک بڑے نقطے کی مانند مشاہدہ کرتا اور انکی وسعت و عظمت کا اندازہ نہیں کرسکتا تھا۔

---☆---☆---

(گزشتہ صفحے کا حاشیہ)

نکال کر سانچے میں ڈالا گیا تو یہ طے کیا گیا کہ پگھلے ہوئے مادے کو جس کا درجہ حرارت بارہ سو ڈگری تھا۔ بتدریج سرد کیا جائے تاکہ دوربین میں کوئی بلبلہ اور شگاف پیدا نہ ہو۔ چنانچہ مخصوص ذرائع سے اس کی حرارت کو محفوظ کیا گیا اور ایک دن میں ایک ڈگری کے حساب سے گرمی کو کم کیا گیا یہاں تک کہ تین سال اور ایک سو پانچ دنوں میں وہ دوربین سرد ہوئی 'اس کے بعد اسے تراشنے والے کے سپرد کیا گیا۔ اس کے تراش کا پیمانہ ایک ملی میٹر کا ایک لاکھواں حصہ تھا۔ جو اس زمانے میں جب کہ ابھی دوسری جنگ عظیم شروع نہیں ہوئی تھی ٹیکنیک کا ایک نادر نمونہ شمار کیا جاتا تھا۔ بالآخر ۱۹۴۱ء میں جب امریکہ جنگ میں شامل ہوچکا تھا یہ دوربین کوہ پالومرکی رصدگاہ کے ٹیلی اسکوپ میں نصب کی گئی اور یہ نوری ٹیلی اسکوپ دوردراز کے ستاروں کا مشاہدہ کرنے کے قابل ہوا۔ اس وقت سے لے کر اب تک دنیا کے صنعتی ممالک نے بہت سی دلکش چیزیں ایجاد کیں۔ لیکن نوری ٹیلی اسکوپ سازی میں کوئی ایسی چیز تیار نہ ہوسکی جو کوہ پالومرکی آسمانی دوربین کا مقابلہ کرسکے۔ (مترجم فارسی)

انسانی جسم کی ساخت کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کا نظریہ

امام جعفر صادقؑ بھی دیگر مسلمانوں کی مانند یہی کہتے تھے کہ انسان خاک سے پیدا کیا گیا ہے۔لیکن آپ اور دوسرے مسلمانوں میں فرق یہ تھا کہ آپ انسانی خلقت کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بھی کہتے تھے جو اس دور کے کسی مسلمان کی عقل میں نہیں آتی تھیں۔ بلکہ بعد کے زمانوں میں بھی کوئی مسلمان اس سلسلے میں امام جعفر صادقؑ کی طرح کوئی تحقیق پیش نہیں کرسکا اگر کوئی شخص کچھ کہتا تھا تو وہ براہِ راست یا بالواسطہ آپ کے شاگردوں سے سنی ہوئی بات ہوتی تھی۔

آپ فرماتے تھے کہ وہ تمام چیزیں جو خاک میں ہیں انسانی جسم میں بھی موجود ہیں البتہ ایک ہی تناسب سے نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض انسان کے جسم میں بہت زیادہ اور بعض بہت کم ہیں اور جوچیزیں زیادہ ہیں'ان میں بھی مساوات نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے سے کم و بیش ہیں۔

آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ انسانی جسم میں چار چیزیں زیادہ اور آٹھ چیزیں کم ہیں اور آٹھ چیزیں انسانی بدن میں بہت کم مقدار میں پائی جاتی ہیں۔

انسانی جسم کی ساخت کے بارے میں یہ نظریہ جو امام جعفر صادقؑ کی طرف سے پیش کیا گیا اس قدر اچھوتا ہے کہ انسان سوچتا ہے کہ کیا آیا جیسا کہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ علمِ امامت کے حامل تھے۔ اور آپؑ کا یہ نظریہ' بشری علوم کا نہیں

بلکہ علم امامت کا نتیجہ ہے؟ کیونکہ ہمارا فہم و ادراک ایسی چیز کو قبول نہیں کرتا کہ ایک عام عالِم جو بشری معلومات سے استفادہ کرتا ہو' ساڑھے بارہ سو سال قبل ایک ایسی حقیقت و واقعیت کا پتہ لگا لے۔ کیا نابغہ ہستیوں کو عام افراد پر یہ امتیاز حاصل نہیں کہ ان کے ذہن ایسی چیزوں کے انکشاف وادراک کے حامل ہوتے ہیں جن تک عام آدمی پہنچ بھی نہیں سکتا اور ان کی نگاہیں اسی علاقہ میں جو دوسروں سے نزدیک جہل کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے ایسی چیزوں کو دیکھتی ہیں جو دوسروں کو نظر نہیں آتیں۔

اگر ایسی چیزیں نہ ہوں تو نابغہ ہستیوں اور ایک عام آدمی کے درمیان کیا امتیاز ہے۔

امام جعفر صادقؑ اس لحاظ سے نابغہ تھے کہ آپ کی عقل ایسی چیزوں کو درک کرتی تھی جو دوسروں کے لئے قابلِ ادراک نہ تھیں اور آپ کی نگاہیں ایسی چیزوں کو دیکھ رہی تھیں جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے تھے۔(۱)

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ تمام معلومات انسان کے باطن میں ہوتی ہیں لیکن افراد کے ظاہری اور باطنی شعور کے درمیان ایک دبیز پردہ موجود ہے جو اس بات میں مانع ہے کہ لوگ اپنے باطنی شعور کی لامحدودیتوں کا نظارہ کریں اور وہاں موجود معلومات سے استفادہ کریں۔

نوابغ اور عام انسانوں میں فرق یہی ہے کہ وہ اپنے باطنی شعور کی لامحدودیوں کو دیکھ سکتے ہیں اور اسکی معلومات سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

ہنری برگسن (فرانسیسی فلسفی جس کا ۱۹۴۱ء میں ۸۱ سال کی عمر میں انتقال ہوا) کہتا ہے کہ ایٹم کیونکہ زمین کی پیدائش کے وقت سے یا کائنات کے آغاز سے قبل ہی موجود تھا

۱۔ اس مقام پر مسیحی مقالہ نگاروں نے اپنے عقیدے کے مطابق یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے یہ نظریات و انکشافات ضروری نہیں کہ علمِ امامت کی وجہ سے ہوں بلکہ ایک عبقری اور غیر معمولی عقل و شعور کا حامل فرد بھی ایسی امتیازی اور خصوصی باتیں دریافت کر سکتا ہے جن پر عام آدمی قادر نہ ہوں۔ (مترجم اردو)

اس لئے وہ کائنات کے متعلق تمام معلومات رکھتا ہے اور بطریقِ اولیٰ انسانی بدن کے جاندار خلیے اپنے وجود سے لے کر آج تک کی تمام معلومات اور دنیا کی تاریخ سے آگاہ ہوں گے۔

لامحدود باطنی شعور کا نظارہ کرنے کی صلاحیت کو برگسن "طاقت اور روحانی قوت" کا نام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ نابغہ ہستیوں کا عام افراد سے فرق یہی ہوتا ہے کہ ان کی "طاقت اور روحانی قوت" دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے اور وہ انسانی بدن کے خلیوں میں موجود معلومات سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے جو خواہ شیعوں کے عقیدے کے مطابق علم امامت رکھتے ہوں، شعورِ باطنی کا نظریہ رکھنے والوں کے مطابق اپنے باطنی شعور سے کام لیتے ہوں یا ہنری برگسن کے نقطہ نظر کے مطابق اپنی طاقتور روحانی قوت سے استفادہ کرتے ہوں۔ جسمِ انسانی کی تخلیق و تشکیل کے بارے میں ایسی بات کہی ہے جو ثابت کرتی ہے کہ آپ اپنے دور کے نیز اپنے بعد آنے والے زمانوں کے انسانوں کے درمیان علمِ اجسام کے لحاظ سے ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے کیونکہ آج ساڑھے بارہ سو سال گزرنے کے بعد آپ کا نظریہ علمی حیثیت سے ثابت ہوچکا ہے اور اس کی صحت میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا۔ آپ نے صرف ان عناصر کے نام نہیں لئے ہیں جو انسانی بدن میں موجود ہیں۔

یہ بتادینا ضروری ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے بتایا ہے کہ انسانی جسم میں ہر وہ چیز موجود ہے جو زمین میں ہے، جو کچھ کرۂ زمین میں ہے وہ ایک سو دو(۱۰۲) عناصر سے وجود میں آیا ہے اور یہی ایک سو دو عناصر جسمِ انسانی میں بھی موجود ہیں۔ البتہ ان میں سے بعض عناصر کا توازن انسان کے بدن میں اس قدر کم ہے کہ اب تک ان کی حقیقی مقدار کا تعین نہیں کیا جاسکا ہے۔

امام جعفر صادقؑ کے اس قول کو جو کچھ خاک میں ہے جسم انسانی میں بھی ہے، آپ کی غیر معمولی فہم و فراست کی دلیل نہیں کہا جاسکتا کیونکہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ

آدمی مٹی سے بنا ہے وہ اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ جو کچھ مٹی میں ہے وہ آدمی کے بدن میں بھی موجود ہے البتہ جو چیز آپ کی غیر معمولی.... صلاحیت اور عقل ودانش پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ آپؑ نے فرمایا ہے کہ "جو کچھ خاک میں ہے وہ آدمی کے بدن میں بھی موجود ہے اس طرح سے کہ ان میں سے چار اجزاء زیادہ' آٹھ ان سے کم اور دیگر آٹھ ان سے بہت کم ہیں" جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں آج یہ نظریہ ثابت ہو چکا ہے۔

جو آٹھ عناصر 'امام جعفر صادقؑ کے قول کے مطابق انسانی جسم میں بہت کم ہیں وہ یہ ہیں مولیبڈینم (Molybdenum)' سیلیم (Selenium)' فلورین (Fluorine)' کوبالٹ (Cobalt)' میگنیز (Manganese)' تانبا (Copper)' جست (Zinc) اور سیسہ (Lead) اور جو آٹھ عناصر مذکورہ آٹھ سے نسبتاً زیادہ ہیں یہ ہیں میگنیشیم (Magnesium)' سوڈیم (Sodium)' پوٹاشیم (Potassium)' کیلشیم (Calcium)' فاسفورس (Phosphorus)' کلورین (Chlorine)' گندھک (Sulphur) اور لوہار (Iron) اور وہ چار عناصر جو انسانی جسم میں بہت زیادہ ہیں ان میں آکسیجن (Oxygen) کاربن (Carbon)' ہائیڈروجن (Hydrogen) اور نائٹروجن (Nitrogen) شامل ہیں۔

انسانی جسم میں ان عناصر کا پتہ لگانا کوئی ایک یا دو دن کا کام نہ تھا۔ یہ کام اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز سے علم تشریح الاعضاء (Anatomy) کے ساتھ شروع ہوا اور اس فن میں دو قوموں نے پیش قدمی کی' ایک فرانس والے اور دوسرے آسٹریا والے۔ دیگر ممالک میں جسم کی چیر پھاڑ اور تشریح کا بہت کم رواج تھا۔ اور مشرقی ممالک میں تو اس کا وجود ہی نہ تھا۔ یورپ کے ملکوں میں آرتھوڈکس' کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیسا اس کی مخالفت کرتے تھے البتہ آسٹریا اور فرانس میں کلیسا کی کھلم کھلا مخالفت کے بغیر اس پر عمل ہوتا تھا۔ اس کے باوجود "مارا" کے دور تک فرانس میں عمل جراحی زیادہ وسعت نہیں پاسکا اور تقریباً پوشیدہ ہی رہا۔ "مارا" نے اس سلسلے میں مشہور ومعروف "لاوازیہ" (جس کا سر ۱۷۹۴ء میں گلوٹین سے جدا کردیا گیا تھا) جیسے چند فرانسیسی

دانشوروں کی مدد سے یہ جاننے کے لئے کہ آدمی کا بدن کن عناصر سے مرکب ہے نظام جسمانی کا تجزیہ کیا تھا۔

"مارا" کے بعد اس کے شاگردوں نے یہ کام جاری رکھا اور عملِ جراحی کے ذریعے بدن کی ساخت کا تجزیہ کرتے رہے۔ یہ طریقہ کار پوری انیسویں صدی اور بیسوی صدی عیسوی کے آغاز تک قائم رہا اور ترقی کرتا رہا۔ یہ عملِ جراحی جو اٹھارہویں صدی کے آغاز میں تقریباً فرانس اور آسٹریا تک محدود تھا۔ یورپ کے دیگر ممالک میں اور پھر دوسرے براعظموں کے کئی ملکوں میں رائج ہوگیا اور آج سوائے ان بعض ممالک کے کہ جہاں طب اور جراحی کی درس گاہیں نہیں ہیں ہر جگہ رائج ہے جہاں جہاں یہ کام ہورہا ہے وہاں ان عناصر کے بارے میں بھی تحقیق ہورہی ہے جن سے انسان کا جسم مرکب ہے۔ کبھی کبھی دو مرکزوں کے درمیان جزئی باتوں میں تو اختلاف ہوجاتا ہے لیکن بڑے نتائج میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور جو تناسب امام جعفر صادقؑ نے بیان فرمایا تھا وہ تمام ممالک میں ہر تندرست آدمی کے متعلق مسلّم اور معتبر ہے۔ مثال کے طور پر تمام ملکوں میں جس تندرست مرد یا عورت کا وزن پینتالیس کلوگرام ہو اسکے بدن میں ۸/۱کلوگرام کاربن موجود ہوتا ہے اور ہم بتاچکے ہیں کہ کاربن ان چار عناصر میں سے ایک ہے جو جسم انسانی کے اندر زیادہ مقدار میں موجود ہیں۔ اسی طرح اس شخص کے بدن میں ۵/۴ کلوگرام ہائیڈروجن پائی جاتی ہے۔

البتہ اگر کسی شخص کی پرانی بیماری کی وجہ سے اس کے بدن کے عضلات کمزور ہونے لگیں یا فاقہ کشی کی وجہ سے ایسا ہو تو اس کے جسم میں ہائیڈروجن کی یہ مقدار باقی نہیں رہے گی اِس کے باوجود ہر نسل کے آدمیوں میں خواہ وہ سفید ہوں یا سیاہ یا زرد' نیز مخلوط نسل لوگوں کے بدنوں میں یہی چار عناصر یعنی آکسیجن' کاربن' ہائیڈروجن اور نائٹروجن دیگر عناصر سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کے بعد آٹھ عناصر ان چار عناصر سے کم ہوتے ہیں' پھر مزید آٹھ عناصر ان مذکورہ آٹھ عناصر سے بھی کم مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ یہ تناسب تمام تندرست انسانوں میں چاہے وہ منطقہ قطبی میں رہتے ہوں یا منطقہ

استوائی میں بشرطیکہ ان کا جسمانی وزن اور عمر برابر ہو' یکساں طور پر قائم ہے اور ڈیڑھ سو سال یا اس سے زیادہ کے مطالعات و تجربات' جسمِ انسانی کی تشکیل کے موضوع پر امام جعفر صادقؑ کے نظریے کی تائید کر رہے ہیں۔

انسان کے نظامِ جسمانی کا تجزیہ چاہے وہ مردہ اجزاء کے متعلق ہو یا ان اجزاء کے سلسلے میں جو ابھی زندہ ہیں۔ (مثلاً وہ چیزیں جو آپریشن وغیرہ میں بدن سے جدا ہوتی ہیں) جاری رہنا یہ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آیا سارے عناصر جو زمین کی دنیا میں ہیں انسان کے بدن میں بھی موجود ہیں یا نہیں؟

ان میں سے بعض عناصر انسانی جسم کے عضلات یا ہڈیوں کی ساخت میں نہیں پائے گئے لیکن خیال ہے کہ یہ بھی بدن کے اندر موجود ہیں۔۔۔۔۔۔ اسی بنا پر ابھی تک اس کا انکشاف نہیں ہوا ہے کہ یہ بہت ہی کم مقدار میں جسم کے اندر موجود ہیں اور تجربہ گاہیں اب تک ان کے وجود کا پتہ نہیں لگا سکی ہیں البتہ چونکہ چھوٹی اور باریک چیزوں کی تحقیق کا کام آگے بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا امید کی جاتی ہے کہ ایک دن انسانی جسم کے تمام عناصر کا انکشاف ہوجائے گا اور بتایا جاسکے گا کہ اس کے اندر ہر عنصر کس مقدار میں ہے؟ اعضاء کے فرائض کے لحاظ سے بدن کے اندر اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں؟ اور اس کی کمی یا فقدان سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟

---☆---☆---

ابراہیم ابنِ طہمان اور ایک قانونی مسئلہ

امام جعفر صادقؑ کے شاگرد ابراہیم ابن طہمان نے ایک مسئلہ نقل کیا ہے جو ایک عباسی خلیفہ کو معزول کرنے کے بارے میں ہے جب کہ یہ معلوم ہوجائے کہ وہ خلافت کا اہل نہیں ہے۔

ابراہیم ابن طہمان کے علاوہ آپ کے کسی اور شاگرد سے اس موضوع کو نقل نہیں کیا گیا ہے۔

ابراہیم ابن طہمان کے قول کے مطابق ایک روز امام جعفر صادقؑ کے محضرِ درس میں یہ سوال پیش ہوا کہ آیا اسلامی فقہ میں کوئی ایسی بنیاد موجود ہے جس کے باعث ایسے خلیفہ کو برطرف کیا جاسکے جو خلافت کی اہلیت نہ رکھتا ہو؟ اور اگر کوئی ایسا اصول موجود نہیں ہے تو ایسی صورت میں کیا آپ کی طرف سے فقہ میں کوئی ایسا حکم شامل نہیں ہونا چاہئے؟

قبل اس کے کہ ہم ابنِ طہمان کی روایت کا تتمہ نقل کریں یہ بتادینا ضروری ہے کہ مذہبِ شیعہ کی فقہ میں امام کو منصب سے معزول کرنے سے متعلق کوئی اصل موجود نہیں ہے کیونکہ امام کی نااہلی کا سوال نہ کبھی پیش آیا ہے نہ پیش آئے گا۔

شیعوں کے عقیدے کے مطابق امام خدا کی طرف سے منتخب ہوتا ہے اور معصوم ہوتا ہے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امام کی اہلیت اور صلاحیت میں ذرّہ برابر بھی شبہ نہیں

ہو سکتا کیونکہ اس کا انتخاب خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور جو شخص اس منصب کے لیے خدا کی طرف سے منتخب ہو وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنی اہلیت سے محروم نہیں ہو سکتا نیز اسی بناء پر وہ معصوم بھی ہوتا ہے اور ہرگز گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ وہ اگرچہ انسانی جسم رکھتا ہے لیکن چونکہ مافوقِ بشر روح کا حامل ہوتا ہے لہٰذا اس سے گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ یہی سبب ہے کہ شیعہ مذہب میں ایسے کسی حکم کا وجود نہیں ہو سکتا جس کی بناء پر ایک امام عہدے سے برطرف ہو جائے اس لیے کہ ایسے حکم کے اجراء کا کبھی موقع ہی نہیں آتا۔

مذہبِ شیعہ میں امام چونکہ قضاوت میں دھوکا نہیں کھاتا اور ناحق فیصلہ نہیں کرتا لہٰذا وہ بہترین قاضی بھی ہوتا ہے دھوکا نہ کھانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ عالم ہوتا ہے اور بشری علم سے زیادہ آگاہی رکھتا ہے' چنانچہ جس وقت کوئی فریادی اس کے سامنے حاضر ہو کر کسی کی شکایت کرتا ہے اور مدعاعلیہ کو بلایا جاتا ہے تو امام سمجھ لیتا ہے کہ آیا مدعی حق پر ہے یا نہیں؟

آیا قبل اس کے کہ فریادی امام کے سامنے حاضر ہو کر شکایت کرے امام اس ظلم سے باخبر ہوتا ہے یا نہیں جو اس پر کیا گیا ہے؟

شیعوں کے عقیدے میں وہ پہلے سے باخبر نہیں ہوتا کیونکہ امام کسی موضوع کے بارے میں اس وقت اطلاع حاصل کرتا ہے جب اس کی طرف متوجہ ہونے کا ارادہ کرے یا کوئی بھی دوسرا اس کی توجہ کو اس طرف مبذول کرائے۔

امام خطا نہیں کرتا' گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اور منصبِ امامت کے لیے سب سے زیادہ لائق ہوتا ہے کیونکہ خدا کی طرف سے چنا ہوا ہوتا ہے۔ اسی بناء پر مذہبِ شیعہ میں اسے برطرف کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

البتہ عباسی خلیفہ شیعوں کے نزدیک' خدا کا چنا ہوا نہیں تھا اور جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے ان میں سے بعض تو علانیہ اور کھلم کھلا گناہ کا ارتکاب کرتے تھے۔

بقول ابنِ طمہان امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے نااہل خلیفہ کو معزول کرنے کا

مسئلہ اٹھایا اور کہا کہ اگر اسلامی فقہ میں اس موضوع پر کوئی حکم نہیں ہے تو اسے فقہ میں داخل کرنا چاہئے لیکن بربنائے روایت امام جعفر صادقؑ نے اس تجویز کو قبول نہیں فرمایا اور نااہل خلیفہ کی برطرفی کے لیے فقہ میں کسی اصول کو شامل کرنے پر راضی نہیں ہوئے۔

سوال کیا جاتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے شاگردوں کی درخواست کیوں منظور نہیں کی! اور غیر صالح خلیفہ کو معزول کرنے کے لیے فقہ اسلامی میں کسی اصول کا اضافہ کرنے پر آمادہ کیوں نہیں ہوئے؟

تو اس کا سبب یہ تھا کہ آپ عباسی خلفاء کے مقابل علانیہ محاذ آرائی کی ابتداء نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جس طرح آپ کے جدِّ بزرگوار حسن ابن علیؑ نے معاویہ سے جنگ نہیں کی اور ان کے بعد امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقر علیہ السلام نے اموی اور عباسی خلفاء سے جنگ آزمائی نہیں کی، امام جعفر صادقؑ نے بھی عباسی خلفاء سے نبرد آزمائی پسند نہ کی۔ اگر آپ مذکورہ اصول کو فقہ میں داخل کرتے تو آپ کے اور خلفاء بنی عباس کے درمیان لڑائی ٹھن جاتی اور آپ ایسا نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں برادر کشی کا سلسلہ قائم ہو۔

قطع نظر اس سے کہ شیعہ امام کو ایک کامل ہستی اور معصوم جانتے ہیں نیز قطع نظر اس سے کہ امام جعفر صادقؑ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس اصول کو فقہ میں داخل کریں جس سے برادر کشی کی جنگ کا راستہ کھل جائے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یونان کے سوا دنیا کے کسی اور ملک میں قانون کے اندر ۱۳۶۸ء تک کوئی ایسی دفعہ شامل نہ تھی جس کے ذریعے ایک نالائق حکمران کو گدی سے اتارا جاسکے۔

قدیم یونان کے بعض شہروں میں جبکہ ہر شہر ایک خود مختار علاقہ تھا اور ہر ایک میں جمہوری نظامِ حکومت قائم تھا۔ قانون کے تحت نااہل حکمران کو شہربدر کردیا جاتا تھا اور اس کے لیے مجلسِ قانون ساز کی دو تہائی اکثریت کی رائے ضروری تھی قدیم روم کے قوانین میں بھی جن کے تغیّرات کئی ادوار پر تقسیم ہوتے ہیں، مجلسِ قانون ساز کی رائے

سے فرمانروا کو برطرف کرنے کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہیں ہے' البتہ کبھی کبھی کوئی رکنِ پارلیمنٹ حکمران کی مخالفت کرتا تھا جن میں سے ایک مشہور ترین شخصیت کاٹون اصغر کی تھی جو سیزرجولیس قیصرِروم کی شدید مخالفت کرتا تھا اور جس نے بالآخر ۴۶ قبل مسیح میں خودکشی کرلی۔ لیکن ممبرانِ پارلیمنٹ کسی خاص قانون کے ذریعے جس طرح سے آج امریکہ کے آئین میں پایا جاتا ہے' حکمران کو معزول نہیں کرسکتے تھے۔

کیتھولک عیسائیوں کے کلیسا کی ایک ہزار نو سو سال کی مدت میں کبھی نہیں دیکھا گیا کہ پوپ مسیحی کلیسا کے قانون اور فقہ کے مطابق برطرفی کا سزاوار قرار پایا ہو۔ اب تک یہاں دو سو اسّی پوپ مسند نشین ہوچکے ہیں اور انیس صدیوں کے طویل دور میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ ان میں سے ایک بھی عیسائیوں کے قانونی اقدام سے معزول ہوا ہو۔ ان میں بعض اپنے عہدے سے الگ ضرور ہوئے اور چودھویں صدی عیسوی میں تقریباً ستر سال تک دارالحکومت روم کو چھوڑ کر فرانس کے شہر آوان یاف میں رہنے پر مجبور ہوئے لیکن ان کی یہ علیحدگی یا فرانس کی سکونت یورپ کے بعض بادشاہوں کی پوپ سے مخالفت کی وجہ سے تھی' کلیسائی قانون کے اثر سے نہیں۔

جو عقیدہ شیعہ اپنے ائمہؑ کے بارے میں رکھتے ہیں تقریباً وہی عقیدہ کیتھولک عیسائیوں کا پوپ کے لیے تھا۔ فرق اتنا ہے کہ شیعہ اپنے ائمہؑ کو عام انسانوں سے بالاتر سمجھتے ہیں لہٰذا ان کا اعتقاد بھی وسیع تر اور بلند تر ہے۔ کیتھولک عیسائیوں کا اعتقاد یہ ہے کہ جو شخص بہتّر۷۲ کارڈینل کی طرف سے اس مذہب کی ریاست و قیادت کے لیے منتخب ہوتا ہے وہ ہر حیثیت سے اس منصب کا اہل ہوتا ہے اور گناہ نہیں کرتا' خاص طور سے اس بناء پر کہ اس کی عمر اس مرحلے سے گزر چکی ہوتی ہے جس میں انسان نفسانی خواہش اور ابلیس کے فریب کا شکار ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے کیتھولک کلیسا کے اصولِ فقہ تحریر کیے ہیں انہوں نے پوپ کو برطرف کرنے کا فیصلہ اس میں شامل کرنے کو نہ صرف یہ کہ پوپ کی بلند منزلت کے ادب و احترام کے منافی سمجھا ہے بلکہ اسے خلافِ عقل بھی سمجھا ہے کیونکہ ان کی عقل کہتی تھی کہ جو بہتّر(۷۲) اشخاص پوپ کا

انتخاب کرتے ہیں وہ یونان یا قدیم روم کے عوام الناس میں سے نہیں ہوتے لہٰذا نااہل پوپ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

یونان اور قدیم روم میں چونکہ مجلسِ قانون ساز کے ارکان عام آدمیوں کی طرف سے چنے جاتے تھے لہٰذا ہوسکتا تھا کہ کچھ نااہل اور فریب کار افراد لوگوں کی حمایت حاصل کر کے ممبر بن جائیں۔ لیکن کارڈینل جو پوپ کا انتخاب کرتے ہیں، عوام نہیں ہوتے جو کسی فریب کار کے دھوکے میں آجائیں۔ دوسرے یہ کہ ایک پوپ کے مرنے اور دوسرے کے درمیان اتنی طویل مدت نہیں ہوتی کہ کسی کارڈینل کو اپنے متعلق خلافِ واقع باتوں کے پروپیگنڈے کا موقعہ مل سکے۔ جس وقت کارڈینل یکجا ہوتے ہیں تو تین چیزوں کو پوپ کے انتخاب کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اوّل تقویٰ اور پرہیزگاری، دوسرے علم اور تیسرے جدوجہد۔ پوپ کا مقام ایک ایسی منزل ہے کہ جس پر فائز ہونے والے کو ایک مستعد اور عملی انسان ہونا چاہئے تاکہ اس عہدے کے فرائض کو انجام دے سکے۔ کارڈینلوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو ایک پوپ کی خصوصیات رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے خود درخواست کی کہ انہیں اس منصبِ ریاست سے معاف رکھا جائے۔ تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ کیتھولک قانون سازوں کا یہ نظریہ درست تھا کہ کلیسا کے قانون میں پوپ کو برطرف کرنے کے لیے کوئی شق نہیں ہونی چاہئے۔

بعض پوپ مذہبی تعصب زیادہ رکھتے تھے اور بعض کم، بعض زیادہ رحم دل تھے اور بعض کم، بعض ابتدائے شب کی عبادت کو ترجیح دیتے تھے اور بعض آخرِ شب کی، بعض بیٹھ کے کتاب پڑھنے کو پسند کرتے تھے اور بعض راستہ چلتے ہوئے مطالعہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے لیکن ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے قطع نظر ایک مخصوص خاندان کے چند پوپ کے علاوہ یہ نہیں دیکھا گیا کہ ایک پوپ ایسے عیوب کا حامل ہو جن کی بناء پر کہا جاسکے کہ یہ کیتھولک مذہب کی ریاست کا اہل نہیں ہے۔

ایک مخصوص خاندان کے پوپ کے علاوہ سب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان میں سے نہ کوئی دولت جمع کرنے کی فکر کرتا تھا نہ مال کی طمع رکھتا تھا۔ دوسرے

لوگ جو طاقت و ہمت دولت جمع کرنے میں صرف کرتے ہیں انہیں یہ حضرات کیتھولک کلیسا کی مالی حیثیت مضبوط کرنے میں لگاتے تھے اور اس میں اتنی کوشش کی کہ آج یہ کلیسا دنیا کے سارے مراکز میں سب سے زیادہ ثروت مند ہے۔۔۔آیا اگر پوپ عام اشخاص کی طرح بیوی بچے رکھنے کے مجاز ہوتے تب بھی اسی طرح دولت کمانے سے بے اعتنائی کرتے یا یہ کہ اہل وعیال کی ذمہ داری اور فکرِ معاش انہیں اس بات پر مجبور کردیتی (۱)۔

ہم بتا چکے ہیں کہ کیتھولک کلیسا کے سربراہ سلاطینِ یورپ کی مخالفت کے علاوہ اور کسی بناء پر عہدے سے برطرف نہیں ہوئے یہاں تک کہ یہ بادشاہ بھی انہیں معزول نہیں کرسکتے تھے کیونکہ ان کا فرمان ان کی معزولی کے لیے موثر اور کافی نہیں تھا۔ نیز کیتھولک فقہ میں بھی ایسی چیز نہیں تھی لہٰذا انہیں روم سے نکال دیا جاتا تھا اور کسی پوپ کا بعض بادشاہانِ یورپ کی مخالفت کا سبب دو چیزیں تھیں' ایک تو ان کے اثرو نفوذ کو توڑنا اور دوسرے کلیسا کی دولت میں تصرف کرنا کیونکہ زمانہ‌قدیم میں بھی یہ بہت ہی متموّل ادارہ تھا۔

بعض قدیم یونانی جمہوریتوں کو چھوڑ کے بدعنوان حکمران کو معزول کرنے کا قانون سب سے پہلے ۱۳۶۸ میلادی میں انگلستان میں وضع ہوا۔ نیز اسی سال پہلی مرتبہ انگریزی

۱۔ کیتھولک پادری اب تک شادی نہیں کرتے تھے اور مجرد زندگی بسر کرتے تھے لیکن اب اس کے لئے ایک وسیع تحریک ابھری ہے کہ یہ بھی شادی شدہ زندگی بسر کریں اور اس کے اثرات یورپ کے کیتھولک ممالک بالخصوص فرانس کی مطبوعات میں نظر آتے ہیں۔ کیتھولک پادریوں کی ایک جماعت کہتی ہے کہ بیوی بچوں کے تعلقات مذہبی فرائض کی ادائیگی سے مانع نہیں ہوتے جیساکہ اگر فوج کا افسر بیوی بچوں والا ہو تو اس کی وجہ سے وہ فوجی ذمہ داریوں سے پہلوتہی نہیں کرتا اگر کیتھولک کلیسا پادریوں کو ازدواجی زندگی کی اجازت دے دے تو فطری بات ہے کہ کارڈنیل اور پوپ بھی بیوی بچوں والے بن جائیں گے۔ (مترجم فارسی)

لفظ "ایم پس منٹ IMPEACHMENT قانون میں شامل ہوا۔ واضح رہے کہ یہ لفظ انگریزی زبان میں پہلے بھی موجود تھا لیکن اس کا جو مفہوم آج انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے قانون و آئین میں لیا جاتا ہے وہ اس وقت نہ تھا۔ یعنی ایسا شدید مواخذہ جو ممکن ہے کسی کی (ایم پس منٹ) معزولی کا سبب بن جائے۔

لیکن اس سال انگلستان میں جو قانون وضع ہوا اس کا اطلاق حکمرانوں پر نہ ہوتا تھا بلکہ اس کی زد میں حکمرانوں کے مشیر وغیرہ آتے تھے۔

جن لوگوں نے یہ قانون وضع کیا ان کا یہ اعتقاد تھا یا وہ اپنا یہ عقیدہ ظاہر کرتے تھے کہ حکمران کوئی ایسا عمل انجام دے ہی نہیں سکتا جس کی اسے سزا دی جائے بلکہ اس کے مشاور اور رفقاءِ کار اسے اس عمل پر اکساتے ہیں اور ان ہی پر (ایم پس منٹ) لاگو ہونا چاہئے۔

---☆---☆---

امام جعفر صادقؑ کے معجزات اور شیعوں کا عقیدہ

جب ہم امام جعفر صادقؑ کے حالاتِ زندگی لکھ رہے ہیں تو آپؑ کے معجزات کے بارے میں شیعوں کا عقیدہ بھی مختصر طور پر بیان کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ تاریخی حیثیت سے یہ روایتیں قبول نہیں کی جاتیں لیکن منقولہ روایات کی جزو ہیں کیونکہ ایک مورخ اور محقق منقولہ روایتوں کو قبول نہیں کرتا۔ جب تک وہ عقلِ سلیم سے مطابقت نہ رکھتی ہوں (بقول مضمون نگار) اس کے باوجود سیاقِ تحریر ہمیں مجبور کرتا ہے کہ مختصراً آپؑ کے معجزات کا تذکرہ بھی کرتے چلیں۔ اجمال اور اختصار کا سبب یہ ہے کہ یورپ کا پڑھنے والا ایسے دسیوں خارقِ عادت واقعات کو پڑھنے پر تیار نہیں ہے جنہیں عقلِ سلیم قبول نہ کرسکے۔ البتہ چند واقعات پڑھ لیتا ہے، جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے حالاتِ زندگی میں دو یا تین معجزے پڑھتا ہے اور اگر مسیحی ہے تو ان پر یقین بھی کرلیتا ہے۔ جو لوگ اس تحقیق میں دلچسپی رکھتے ہیں ان میں روم کی یونیورسٹی کا استاد اور (بیوگرافی آف محمدؐ) سوانح حیات حضرت محمدؐ کا مصنف فرانسکو گابریلی بھی ہے جو ایک مسیحی مومن ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ مسیح نے لازاروس کو مرنے کے تین دن بعد زندہ کردیا تھا۔ اسی بناء پر یہ مصنف پیغمبرِ اسلامؐ کے حالات لکھتے ہوئے شیعوں پر معترض نہیں ہوتا کہ وہ امام جعفر صادقؑ کے معجزات پر کیوں عقیدہ رکھتے ہیں۔

تمام قدیم مذاہب میں صاحبانِ ایمان کے ذہنوں میں معجزہ کا تصور موجود تھا اور وہ

کسی ایسے پیغمبر پر ایمان نہیں لاتے تھے جو معجزہ نہ دکھا سکے۔ کیونکہ وہ معجزہ کو پیغمبری کا جزو لاینفک سمجھتے تھے۔ درحالیکہ اٹھارویں صدی سے لے کر اس کے بعد تک جن لوگوں نے یورپ اور بالخصوص امریکہ میں پیغمبری کا دعویٰ کیا کسی نے ان سے معجزے کا مطالبہ نہیں کیا اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ پیغمبری کے مدعی سابق انبیاء کے مقابلے میں زیادہ خوش نصیب تھے کیونکہ لوگ ان کی باتیں سننے کے لئے معجزے کا انتظار نہیں کرتے تھے۔ یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ معجزہ نے انہیں ادیان میں رواج پایا جو مغربی ایشیا میں ظاہر ہوئے اور مشرقی و جنوبی ایشیا میں کوئی مسئلہ معجزے کے نام سے موجود نہیں تھا اور نہ ہی جو مذاہب چین' جاپان اور قدیم ہندوستان میں ظہور پذیر ہوئے ان میں معجزے کا وجود تھا نہ ان کے پیرو اپنے پیغمبروں پر ایمان لانے کے لئے ان سے معجز نمائی کے منتظر یا خواہشمند تھے۔

یورپی مفکرین میں فرانس کارنن پہلا شخص تھا جو اس فکر میں لگ گیا کہ کس وجہ سے مشرقی اور جنوبی ایشیا کے مذاہب میں معجزہ کا مسئلہ نہیں پایا جاتا جب کہ مغربی ایشیا کے مذاہب میں اس کا وجود تھا۔

رنن کا خیال ہے کہ اس کی بنیاد قوموں کے جذبات و احساسات پر تھی۔ چین' جاپان اور ہندوستان میں خاندانی اور قومی تربیت اس انداز پر تھی کہ ان کے افراد اپنے مربّیوں اور پیشواؤں کی بات سننے پر آمادہ رہتے تھے اور اپنے پیغمبروں کو برحق ماننے کے لئے ان سے معجزے کے متمنی نہیں ہوتے تھے۔ لیکن مغربی ایشیاء کی قوموں نے اس طرز کی پرورش نہیں پائی تھی۔ اور وہ اپنے مربّیوں اور پیغمبروں کے اقوال ماننے کے لئے روحانی آمادگی نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی پیغمبری کو تسلیم کرنے کے لئے ان سے ایسی چیزیں دیکھنا چاہتے تھے جو ان لوگوں کے اوپر پیغمبر کی برتری ثابت کردیں۔ اسی بناء پر جو پیغمبر مغربی ایشیاء میں ظاہر ہوئے وہ معجز نمائی پر مجبور تھے۔

البتہ جاپان' چین اور قدیم ہندوستان کے پیغمبر صرف کلام اور زبانی ہدایت یا لکھائی کی ایجاد کے بعد تحریر کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتے تھے۔ آج ان کا کلام

ہماری نظر میں معمولی معلوم ہوتا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ آخری صدیوں میں علم و ادب کی ترقی کی وجہ سے ہر جگہ خیالات کی سطح بلند ہو چکی ہے اور قوتِ فکر پہلے سے قوی تر ہو چکی ہے۔

ہندوستان کی مذہبی کتاب رگ وید کے مضامین آج ہمارے نزدیک کوئی خصوصیت نہیں رکھتے اگر اس کی کوئی چیز ہماری نظر میں آتی ہے تو وہ اس کی سبک اور سادہ عبارت ہے جو قدیم آباؤ اجداد کی کہی ہوئی اور لکھی ہوئی ہے ورنہ اس کے مضامین ہمارے لئے قابلِ توجہ نہیں ہیں۔ البتہ ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ یہ کتاب بقول اس کے جرمن مترجم ماکس مولر کے خط و کتابت کی ایجاد سے سینکڑوں سال یا اس سے بھی زیادہ مدت بعید سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہے اور قدیم ہندوستان کے روحانی پیشوا کتاب کے مضامین کو جو پچاسی ہزار کلمات پر مشتمل ہیں حفظ کرکے دوسروں کے سامنے بیان کرتے تھے تاکہ وہ بھی انہیں یاد کرلیں۔

ایک ایسے ہندوستانی کاشتکار کی اطلاعات اور فکری سطح کو نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے جس نے آج سے چار ہزار سال قبل کسی روحانی بزرگ کی زبان سے رگ وید کا کوئی حصہ سنا تھا۔ اس پر کس حد تک اس کا اثر ہوا ہوگا۔ جن لوگوں نے قدیم زمانوں میں رگ وید کے مضامین بیان کئے وہ جانتے تھے کہ گفتگو جس قدر سادہ ہو بہتر ہے کیونکہ یہ سننے والوں پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔

مثلاً اس میں صبح کے وقت طلوعِ آفتاب کا منظر اس سادگی سے بیان کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے اس زمانے میں بچّوں کی کسی کتاب سے انتخاب کیا گیا ہے۔ اسی طرح دریاؤں میں پانی کی روانی اور ہوا کے جھونکوں سے درختوں کی شاخیں ہلنے کا ذکر اس قدر سادگی سے کیا گیا ہے کہ جیسے رگ وید کے مضامین کی تدوین کرنے والے یہ بات مدرسے کے چھوٹے بچّوں کو بتانا چاہتے ہوں اور بے شک ان کی اسی سادگی اور عام فہم ہونے کی وجہ سے ہزاروں سال پہلے اہلِ ھند کے ذہن ان سے متاثر ہوتے تھے اور آج جب ہم ماکس مولر کے ترجمے میں ان مضامین کو پڑھتے ہیں تو سمجھنے میں ذرّہ برابر

زحمت نہیں ہوتی۔

رنن کہتا ہے کہ جاپان، چین اور ہندوستان کے لوگ اہلِ مناظرہ تھے یعنی فطرت کے مناظر کو باریک بینی سے دیکھتے تھے درحالیکہ مغربی ایشیاء والوں کی نظر اتنی گہری نہ تھی اور وہ اہلِ مناظرہ نہیں تھے کہ جس کے نتیجے میں انکشافات پر قادر ہوتے۔ ان کے پیشِ نظر صرف محسوسات تھے اور وہ ان سے ہٹ کے کسی چیز کی تحقیق نہیں کرسکتے تھے۔

عبرانی یعنی جن میں حضرت موسیٰؑ کا دین ظہور پذیر ہوا، اہلِ فلسطین جن میں حضرت عیسیٰؑ کا دین ظہور پذیر ہوا اور جزیرۃ العرب کے باشندے جہاں اسلام کا اعلان ہوا۔ جن جذبات و احساسات کے حامل تھے انہیں جانچنے کے لئے تاریخی اسناد موجود ہیں اور ان سے سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ تمام لوگ مادی افراد تھے جو محسوسات کی حدود سے باہر کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ان کے درمیان صرف عرب لوگ ہی ادب سے سروکار رکھتے تھے اور شعر کو پسند کرتے تھے لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ عالمِ معنوی کی طرف توجہ کے لحاظ سے یہ سب سے بلند تھے اور دیگر اقوام کی سوچ کھانے پینے اور سونے سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔

رنن کہتا ہے کہ جو قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عربوں کی فکری سطح عبرانیوں اور قدیم فلسطین کے باشندوں کی فکری سطح سے بلند تھی ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قرآن میں علم کا تذکرہ کیا گیا ہے جب کہ تمام عہدِ عتیق میں اس کے متعلقات کے علاوہ علم کا ذکر تک نہیں ہے اس کے باوجود قرآن میں بھی عالمِ آخرت کے اندر نیکو کاروں کے اجر و جزا کا بیان کھانے پینے اور دیگر جسمانی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے کیونکہ عرب کے بدو کسی اور جزاء کا تصور نہیں کرسکتے تھے۔

جس وقت قومیں مادی احساسات میں اس طرح محدود ہوں تو ضروری ہے کہ جو پیغمبران کے درمیان ظاہر ہو وہ معجزہ بھی رکھتا ہو تاکہ لوگ اس کی طرف لوٹ آئیں اور

اس کی جانب مائل ہوں۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے جب پیغمبری کا دعویٰ کیا تو اس بات پر مجبور ہوئے کہ لوگوں کے سامنے معجزہ کے ذریعے اپنی برتری کو پیش کریں اور ان پر ثابت کریں کہ ہم خدا کی طرف سے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں لیکن پیغمبرِ اسلامؐ کے لئے یہ مجبوری نہ تھی کیونکہ عرب کے بدوؤں نے کسی قدر عالمِ معنوی سے بہرہ مند ہونے کے سبب (بقولِ مضمون نگار) محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے معجزے کی خواہش نہیں کی۔

آج ایک روشن فکر شیعہ امام جعفر صادقؑ سے معجزہ نہیں چاہتا اور سمجھتا ہے کہ آپ کا سب سے بڑا معجزہ آپ کا علم تھا جو زیورِ تقویٰ سے آراستہ تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ رنن ایک عیسائی تھا اور ہم نہیں سمجھتے کہ مسیحیت کے بارے میں اس کے پرخلوص عقیدے پر شبہ کیا جاسکتا ہے اس کی دلیل حضرتِ عیسیٰؑ کے حالاتِ زندگی پر ایک مفصل اور گراں قدر کتاب کی تالیف ہے جو ویٹیکن میں کافی مقبول ہوئی اور اس کے ادارے کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ تمام روحانی مراکز میں اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ کیا جائے، سبھی جانتے ہیں کہ کیتھولک کلیسا کی تاریخ میں بہت کم ایسا اتفاق ہوا ہے کہ مسیحیت کے بارے میں عیسائی علماء کے علاوہ کسی مصنف کی کوئی کتاب اس ادارے کے نزدیک معتبر و مستند قرار پائی ہو اور روحانی مراکز کو اس کے مطالعے کی تاکید کی گئی ہو۔

لہٰذا رنن پر یہ تہمت نہیں لگائی جاسکتی کہ اس نے کوئی ایسی بات کہنے کی کوشش کی ہے جس سے اس کے دین کے متعلق مذہبی کتابوں کی وقعت کم ہو، درحالیکہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ عہدِ عتیق کے بارے میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ عہدِ عتیق عبرانیوں کی کتابیں تھیں نہ کہ عیسائیوں کی اور عیسائیوں کی کتابیں چار انجیلیں ہیں جن کے مجموعے کو عہدِ جدید کہا جاتا ہے۔

رنن کہتا ہے کہ میرے نزدیک عبرانی علماء بعد میں اس طرف متوجہ ہوئے کہ عہدِ عتیق ہر قسم کے علمی مواد سے محروم ہے اور وہ اس کوشش میں لگ گئے کہ چند کتابیں

لکھ کر اس کے ساتھ شامل کردیں تاکہ اس کی تلافی ہوجائے اور وہ کتابیں اسفارِ خمسہ (یعنی پانچ کتابوں) سے جو عہدِ عتیق کا اصلی حصّہ ہیں جداگانہ ہیں۔

رنن مشرقی اور جنوبی ایشیاء اور مغرب کے ادیان میں معجزے کے مسئلے پر اپنی بحث سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ مغرب کے ادیان میں بغیر معجزے کے دین آگے نہیں بڑھتا تھا کیونکہ لوگوں کے غور و فکر کا معیار اتنا بلند نہیں تھا کہ پیغمبر کا کلام سنتے ہی اس کی طرف مائل ہوجائیں اور اس کو قبول کرلیں۔ رہی یہ بات کہ مغربی ایشیاء کے پیغمبر جیسا انہوں نے کہا ہے کہ آیا معجزنمائی پر قادر تھے یا نہیں؟ تو یہ ایسا موضوع ہے جس میں رنن نے مداخلت نہیں کی ہے اور اس بات کی کوشش نہیں کی ہے کہ عقلی اور منطقی حیثیت سے معجزہ کی تحلیل اور تجزیہ کرے،وہ اپنے سکوت سے اس نظریئے کی تائید کرتا ہے کہ معجزہ کو تعبّدی طور پر مان لینا چاہئے۔البتہ قدیم زمانے میں اسی بناء پر جس کا پہلے ذکر ہوچکا ہے لوگ امام سے معجزے کے منتظر رہتے تھے اور امام جعفر صادقؑ نے بھی جیسا کہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے متعدّد معجزے دکھائے ہیں۔

راویوں میں سے ابنِ عطبہ بھی ہے، جو کہتا ہے کہ ہم امام جعفر صادقؑ کے ہمراہ کوہِ صفا کے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور ہمارے ایک جانب خانہء کعبہ نظر آرہا تھا کہ اتنے میں حاضرین میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ آیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ ــــــ" ایک مومن مسلمان اس گھر (خانہءکعبہ) سے برتر ہے؟ آپ نے جواب دیا ہاں، کیونکہ خدا کے نزدیک ایک مومن مسلمان کی اتنی قدرومنزلت ہے کہ اگر وہ اس پہاڑ کی طرف اشارہ کرکے کہے کہ اے پہاڑ میرے قریب آجا تو وہ قریب آجائے گا۔ جونہی آپ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہم لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پہاڑ متحرک ہوا اور آپ کے قریب آگیا۔ امامؑ نے پہاڑ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے تجھے اپنے پاس بلایا نہیں تھا۔ یہ سنتے ہی پہاڑ واپس ہوا اور اپنی جگہ پہنچ کر ساکن ہوگیا"۔

قبل اس کے کہ ہم امام جعفر صادقؑ کے دیگر معجزات کا (جیساکہ شیعوں کا عقیدہ ہے) تذکرہ کریں تاکہ شیعوں کے نقطہء نظر سے ان کی تحلیل اور تجزیہ کیا جاسکے یہ بتا

دینا ضروری ہے کہ امام جعفر صادقؑ (بقول مضمون نگار) اسلامی پیشواؤں میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو علم کے ذریعے بھی خدا کی معرفت کرانے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے خدا کی معرفت کے لئے صرف احکامِ دین پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ لوگوں کو علم کے میدان میں لانے کی کوشش کی تاکہ مسلمان جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے بارے میں ان کی معلومات میں اضافہ ہو اور عجائباتِ عالم کو جاننے اور سمجھنے کے بعد پہلے سے زیادہ اس بات کے قائل ہوسکیں کہ ایک عالم و دانا خالق نے اس دنیا کو پیدا کیا ہے اور وہی مقررّہ قوانین کے ساتھ اس کا انتظام چلاتا ہے۔

آپؑ جانتے تھے کہ ایک محدود اور نادان عقل ایک محدود اور نادان کی ہی پرستش کرسکتی ہے اور جس قدر اس کا ایمان قوی ہوگا وہ ایسے خدا کی پرستش کرے گی جو اس کے خیالات سے مطابقت رکھتا ہو۔

لیکن اگر قوتِ فکر ارتقاء کی منازل طے کرے اور عقل و دانش میں اضافہ ہوجائے تو ایسی فہم و دانش کا حامل ایسے خدا کی پرستش کرے گا جو اس خدا سے بزرگ تر ہوگا جس کی پرستش ایک نادان آدمی کرتا ہے اور جب کسی کی وسعتِ فکر اور دانائی تین گنا ہو جاتی ہے تو وہ اسی نسبت سے اپنی عقل سے بزرگ تر خدا کا ادراک کرتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے تھے کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں وہ جاہل ہیں اور جو لوگ خدا کے وجود میں تردّد اور شک کرتے ہیں وہ بھی جاہل ہیں۔ جو شخص عالم ہوگا وہ ناممکن ہے کہ خدا کے وجود کا قائل نہ ہو چونکہ علم محدود نہیں ہے لہٰذا کسی شخص کی معلومات میں جس قدر اضافہ ہوگا اسی نسبت سے خدا کے بارے میں اس کا عقیدہ پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ خدا کو صرف انسان ہی نہیں پہچانتے بلکہ تمام موجوداتِ عالم اس کی پرستش کرتے ہیں یہاں تک کہ جس طرح ایک نادان اور دانا کے خدا پر اعتقاد میں فرق ہوتا ہے اسی طرح دنیا کی مختلف مخلوقات کے درمیان بھی خدا شناسی میں فرق موجود ہے اور موجوداتِ عالم کا ہر گروہ کسی نہ کسی شکل میں خدا کو پہچانتا ہے اِس نظریئے کی بنا پر سارے جانور حتیٰ کہ جمادات بھی خدا کو پہچانتے ہیں اور آج یہ

نظریہ صدر المتالہین کی تحقیق کی رو سے بے بنیاد نظر نہیں آتا کیونکہ (صدر المتالہین کے بقول) حیوانات یا جمادات جو خدا کی پرستش کرتے ہیں ضروری نہیں ہے کہ خدا کے بارے میں ان کا شعور کسی توحیدی مذہب کے پیرو کے مانند ہو۔

مثلاً ممکن ہے کہ (بقول مضمون نگار) ایک پرندے کے لئے لامحدود فضا خدا ہو یا پتھر کے اندرونی ذرّات کے لئے جن کے الیکٹران ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں، مکمل سکون خدا قرار پائے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے تھے کہ خدا کے بارے میں شک جہالت سے پیدا ہوتا ہے اور عالم حتمی طور پر خدا کا معتقد ہوتا ہے۔ اگرچہ خالق کے لئے خدا کے سوا اور کوئی نام تجویز کرے۔ جیسا کہ آپؑ نے بیان فرمایا کہ مختلف قوموں نے جو مختلف نام خدا کے لئے منتخب کئے یا کررہی ہیں وہ ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں لیکن نوع بشر خدا کے عقیدے سے ہرگز بے نیاز نہیں ہوسکی، یہاں تک کہ جو لوگ وجودِ خدا کے منکر ہیں وہ کسی دوسری چیز پر اعتقاد رکھتے ہیں اور وہی ان کی نظر میں خدا ہوتی ہے چاہے وہ خود اس بات کی طرف متوجہ نہ ہوں کہ وہ اس کے معتقد ہیں۔

مشہور نازی "ژولیوس اشترایخر" اس بات پر فخر کرتا تھا کہ وہ خدا کو نہیں مانتا، لیکن اس چیز سے غافل تھا کہ درحقیقت وہ خدا کا معتقد ہے اور نسلی برتری کا اصول اس کا خدا ہے یہیں سے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ خدا شناسی کی ہر قسم ایک اصول پر استوار ہے۔

ایک قدیم انسان جو رعد اور بجلی کی کڑک سن کر کانپ اٹھتا تھا غاروں میں پناہ لیتا تھا، سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش کرتا تھا وہ ایک اصول کی پرستش کرتا تھا۔ اور اس زمانے میں توحیدی مذاہب کے پیرو بھی جو خدائے واحد و یکتا کی پرستش کرتے ہیں، ایک اصول کی پرستش کرتے ہیں۔

کرۂ ارض پر مذہبی عقائد کے آغاز سے جو جادوگری کے ہمراہ نمودار ہوئے آج تک دنیا میں مشرق سے لے کر مغرب تک تمام مذاہب ایک حیثیت سے آپس میں ایک

دوسرے سے مشابہ ہیں اور وہ یہ کہ سبھی ایک اصول پر عقیدہ رکھتے ہیں اور دنیا کے کسی حصے میں ابتدا سے آج تک خدا کا عقیدہ مادی شکل نہیں رکھتا تھا اور نہ رکھتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ خدا پر اعتقاد رکھنے سے افراد کو مادی فوائد حاصل ہوجائیں لیکن خود وہ عقیدہ ایک اصول ہی ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ جس طرح دس لاکھ سال قبل کا انسان جو چار ہاتھوں اور پاؤں پر چلتا تھا اور جو عمر کی اس منزل تک نہیں پہنچتا تھا کہ اس کے دانت جواب دے جائیں' خدا پر عقیدہ کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ آج کا انسان بھی جس کے قدم چاند تک پہنچ چکے ہیں' خدا پر اعتقاد کی ایسی ہی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر قوم خدا پر عقیدہ رکھتی ہے لیکن اس عقیدے کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اور بعض اقوام میں تو ہر گروہ یا ہر فرد کا خدا مختلف حیثیت رکھتا ہے لیکن کوئی ایسا نہیں ہے جو خدا کا معتقد ہی نہ ہو چاہے مادہ پرستوں کی مانند ہو کہ جن کا خدا نہ ابتداء رکھتا ہے نہ انتہاء(۱)

جب کہ اقوام اور افراد کے عقائد کے مطابق خداؤں کی نوعیت میں فرق ہے تو اس میں بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ خداؤں کے ناموں میں فرق ہو۔ جدید ترین نام جو اس دور میں خدا کے لئے وضع ہوا ہے وہ "گراویٹون" ہے یہ لفظ فرانسیسی زبان کے "گراویتہ" اور انگریزی زبان کے "گراویٹی" سے اخذ کیا گیا ہے یعنی قوتِ جاذبہ جس طرح الیکٹران کو برقی طاقت کا ایک ذرّہ کہا جاتا ہے' اسی طرح گراویٹون بھی قوتِ جاذبہ کی طاقت کا ایک ذرّہ شمار کیا جاتا ہے اور جدید مذہبی فرقہ "گراویٹی" کے حامی کہتے ہیں

۱۔ مقصد یہ ہے کہ مادہ پرست توحیدی مذاہب کے پیروکاروں کی مانند ایک ازلی اور ابدی خدا پر عقیدہ نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود کیونکہ ایک آئیڈیل ہدف تک پہنچنا چاہتے ہیں اور ان کی نظر میں ایک انتہا ہے اس بناء پر مصنف کے بقول ان کا خدا نہ انتہاء رکھتا ہے اور نہ ابتداء (مترجم فارسی)

کہ خداوندِ عالم جو دنیا کا خالق اور محافظ ہے وہ گراویٹون ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ قوی اور تیز رفتار کوئی اور چیز نہیں ہے۔ گراویٹون ایک لحظہ میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک (جس کی وسعت بقول آئین اسٹائن تین ہزار ملین نوری سال ہے اور آج کی تحقیق یہ ہے کہ یہ فاصلہ اس سے بھی زیادہ ہے) جاتا اور واپس آجاتا ہے۔ جب کہ برقی مقناطیسی قوت (Electromegnetic) آنے اور جانے میں چھ ہزار ملین نوری سال لیتی ہے۔ جو شخص آج گراویٹی فرقے کا پیرو ہے اس کی نظر میں دنیا کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا گراویٹون ہے اور جو شخص امام جعفرصادقؑ کے زمانے میں دہریہ تھا اس کی نظر میں دنیا کا خالق اور منتظم دہر (زمانہ) تھا اور وہ دینِ اسلام کے خدا کو نہیں مانتا تھا کیونکہ اس دین کے اصول ہی کا منکر تھا۔

اور آج جو شخص گراویٹی مذہب کا پیرو ہے وہ بھی مسیحیت کے خدا کی پرستش نہیں کرتا کیونکہ وہ تثلیث کا قائل نہیں ہے (لیکن بقول مضمون نگار) وہ دہریہ خدا پرست تھا جیسا کہ گراویٹی مذہب کا معتقد بھی خدا پرست ہے اگر ہم معرفتِ خدا کے لحاظ سے دہریئے کے بارے میں دہریئے کے عقیدے اور گراویٹون کے بارے میں جدید گراویٹی مذہب والے عقیدے کے درمیان فیصلہ کرنا چاہیں تو ماننا پڑے گا کہ جو شخص آج گراویٹون کو خدا مانتا ہے وہ خدا شناسی میں دہریئے سے بلند ہے کیونکہ یہ اپنے خدا کو اس سے بہتر پہچانتا ہے۔

جو شخص آج گراویٹون کو خدا جانتا ہے وہ آگاہ ہے کہ گراویٹون کم از کم نظامِ شمسی کے اندر اس عالم کی سب سے زیادہ قوی اور سریع الحرکت طاقت ہے (کیونکہ ابھی تجربے سے یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ نظامِ شمسی کے باہر بھی قوتِ جاذبہ اس دنیا کی مانند کام کرتی ہے) جو ایک لحظہ میں نظامِ شمسی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جاتی اور واپس آجاتی ہے کوئی چیز اس کو روک نہیں سکتی اور یہ سورج کے قلب سے بھی جہاں درجہ حرارت بیس ملین ڈگری سے زیادہ ہوتا ہے، عبور کر جاتی ہے۔ اسی طرح ستاروں کے درمیان وسیع فضاؤں سے گزرتی ہے جہاں مطلق صفر برودت کی

کار فرمائی ہے۔

برقی رو کو تو کسی ذریعے سے روکا جاسکتا ہے لیکن گراویٹون کے گزرنے کو کسی ذریعے سے نہیں روکا جاسکتا اور یہ جس آسانی کے ساتھ ایک آہنی دیوار سے گزرتا ہے اسی طرح چینی یا بلور کی دیوار سے بھی گزر جاتا ہے۔ گراویٹون خود انسانی خون کے ہر ذرہ میں موجود ہے جس طرح سورج اور نظامِ شمسی کے دیگر کروں میں بلکہ قوی احتمال ہے کہ دوسرے شمسی نظاموں اور کہکشانوں میں بھی موجود ہے۔

آج گراویٹون کو خدا ماننے والا جانتا ہے کہ گراویٹون کی سرعت چونکہ فوری ہوتی ہے لہٰذا وہ ہر جگہ اور ہر موقع پر پایا جاتا ہے اور موجوداتِ عالم کے تحفظ میں (کم از کم اس نظامِ شمسی کے اندر) یہ اس قدر موثر ہے کہ اگر قوتِ جاذبہ کی روانی ایک لمحے کے لئے منقطع ہوجائے تو نہ صرف اجسام کا ریشہ ریشہ ایک دوسرے سے جدا ہوجائے بلکہ ان ریشوں کے اندر ایٹم بھی ایک دوسرے سے جدا اور ہر ایٹم کے اندر الیکٹران بھی مرکزی نقطے سے الگ ہوجائیں۔ نتیجہ یہ ہو کہ مادہ جو منجمد یا سیال یا بخارات کی صورت میں ہے فنا ہوجائے' بلکہ اگر ہم اس سے زیادہ آسان زبان میں کہیں تو یہ ہستی اور یہ کائنات جو نظر آرہی ہے کم از کم نظامِ شمسی کے اندر فنا و نابود ہو کر رہ جائے اور یہ عمل صرف ایک لحظہ کے اندر انجام پاسکتا ہے۔ دنیا میں اس سے بڑا کوئی سانحہ نہیں ہوسکتا کہ گراویٹون یا قوتِ جاذبہ کی رفتار ایک لحظہ کے لئے رک جائے' کیونکہ اسی لحظہ میں نہ صرف یہ کہ مادہ فنا ہوجائے گا بلکہ انرجی بھی ختم ہوجائے گی کیونکہ انرجی کی بقاء بھی برقی طاقت اور (Electromagnetic) بجلی اور مقناطیس کی طاقت کی طرح قوتِ جاذبہ سے وابستہ ہے۔

آج گراویٹون کو خدا ماننے والا انسان واقف ہے کہ مادہ بغیر قوتِ جاذبہ کے باقی نہیں رہ سکتا جس طرح بغیر اس کے انرجی باقی نہیں رہ سکتی۔ وہ نہیں جانتا کہ گراویٹون کیا شئے ہے جس طرح یہ نہیں جانتا کہ برقی طاقت کیا چیز ہے البتہ جس طرح برقی طاقت کے وجود پر ایمان رکھتا ہے کیونکہ اس کے خواص سے فائدہ اٹھاتا ہے؟ اسی طرح گراویٹون

کی موجودگی پر بھی یقین رکھتا ہے۔ جو شخص آج گراویٹون کو خدا مانتا ہے۔ وہ قوتِ جاذبہ کے قانون سے بھی باخبر ہے۔ درحالیکہ ساڑھے بارہ سو سال قبل جو شخص دہر (زمانے) کو خدا مانتا تھا وہ دہر کے اصل قانون سے مطلع نہیں تھا اور اس بارے میں اس کی اطلاعات محسوسات کی حدود مثلاً فصلوں کے تغیر سے آگے نہیں بڑھی تھیں۔

جو شخص آج گراویٹون کو کائنات کا خالق اور منتظم مانتا ہے وہ جانتا ہے کہ مادے اور انرجی کا راز گراویٹون میں ہے اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مادہ اور انرجی کیونکر وجود میں آئے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ گراویٹون کیا ہے' اور کیونکر وجود میں آیا؟ اگر یہ راز آشکار ہوجائے تو مادہ اور انرجی کہ جنہیں قدیم زمانے میں جسم و روح کہا جاتا تھا کے تمام اسرار منکشف ہوجائیں گے۔ یہاں تک کہ حکماءِ یونان نے روح پر حرکت کا بھی اضافہ کیا تو اس کے بعد مادے یا جسم کا راز ایک ہوا اور حرکت و روح کا راز ایک۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ گراویٹی مسلک کے پیروکاروں کا عقیدہ جو اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ ——— گراویٹون خدا ہے' یا یہ کہ قوتِ جاذبہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے طبیعی لحاظ سے شاید ایک حقیقت نہ ہو۔ باالفاظِ دیگر کہا جاسکتا ہے کہ علمِ فزکس قوتِ جاذبہ کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت مانتا ہے۔ لیکن چونکہ نوع بشر اس نظامِ شمسی سے باہر کے قوانین سے بخوبی واقف نہیں ہے لہٰذا یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ قوتِ جاذبہ کائنات کی سب سے بڑی اور زمین کو خلق کرنے والی واحد طاقت ہے اور دوسری تمام طاقتیں اسی سے پیدا ہوئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جس روز انسان دیگر شمسی نظاموں کے طبیعی قوانین کی تہہ تک پہنچ جائے تو سمجھ لے کہ قوتِ جاذبہ کائنات کی فروعی طاقتوں میں سے ایک ہے اور اصلی طاقت کوئی دوسری ہے۔اور شاید اسی طرح ایک دن ایسا آئے جب یہ معلوم ہو کہ تمام پیشِ نظر طبیعی قوانین ایک ایسے مثبت سائے یا جسم کا منفی سایہ یا جسم ہیں کہ جہاں تک ہماری نظر نہیں پہنچتی اور طبیعات کا ہر قانون دوہرا ہے جس میں سے ایک' دوسرے قانون کا سایہ یا جسم قرار پاتا ہے لیکن ہم اپنی دنیا میں صرف ایک ہی کو دیکھتے ہیں اور دوسرے کا مشاہدہ نہیں کرسکتے جو ہوسکتا ہے

اصلی سایہ یا جسم ہو جو چیز ذہن کو اس مفروضے کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ضدِ مادہ کی تحقیق ہے اور یہ وہ مادہ ہے جس کے ایٹموں میں الیکٹران مثبت ہوتے ہیں اور پروٹان منفی۔ لیکن ابھی تک یہ کوئی نہیں جانتا کہ جو عناصر ضدِ مادہ کے ایٹموں سے وجود میں آئے ہیں (اگر ایسا ہوا ہو) تو وہ کیا ہیں اور کون سے فزیکی اور کیمیائی خواص کے حامل ہیں؟

اور جب ایٹم میں ضد مادہ کا پتہ لگالیا گیا تو یہ مفروضہ وجود میں آیا کہ شاید ایٹم کی ایک دوسری قسم بھی موجود ہو جس کے اجزاء کا برقی دباؤ کوئی دوسری شکل رکھتا ہو۔

باوجودیکہ ہمیں یقینی طور پر علم نہیں کہ آیا قوتِ جاذبہ سب سے بڑی طاقت اور کائنات کی اصلی قوت ہے یا کسی دوسری طاقت کی شاخ ہے لیکن چونکہ ہمارے نظامِ شمسی میں دوسری طاقتوں پر اس کی برتری ثابت ہے لہٰذا جو شخص گراویٹی مذہب رکھتا ہے اور گراویٹون کو خدا مانتا ہے اس کی خدا شناسی اس شخص سے زیادہ ہے جو امام جعفر صادقؑ کے دور میں دہریہ تھا اور دہر کو خدا مانتا تھا۔

اگرچہ بالآخر یہی ثابت ہوا کہ آج گراویٹی مسلک کا پیرو بھی سابق دہریے کی مانند دھوکا کھا گیا اور خدا نہ گراویٹون ہے نہ دہر۔ البتہ جو شخص آج گراویٹون کو خدا مانتا ہے اس نے اس کی تحقیق میں قدیم دہریے سے زیادہ کوشش کی ہے۔

شاید یہ کہا جائے کہ گراویٹی مسلک والوں نے خدا کو پہچاننے کے لئے خود زیادہ جدوجہد نہیں کی بلکہ دوسروں نے کوشش کر کے گراویٹون کو معلوم کیا اور پھر اس کا تعارف کرایا یعنی اہلِ علم نے بغیر اسے خدا جانے ہوئے اس کی شناخت کی زحمت اٹھائی لیکن اس بات سے گراویٹی مسلک والوں کے عقیدے کا وزن کم نہیں ہوتا' کیونکہ آدمی خدا شناسی کے مرحلے میں یا اپنی کوشش سے کام لیتا ہے یا دوسروں کی سعی سے استفادہ کرتا ہے۔

ایک محقق کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ حصولِ علم خدا کی معرفت میں معاون ہوتا ہے اور آدمی یا تو اپنی ہمت اور کاوش سے علم حاصل کرتا ہے یعنی استنباط و انکشاف کرتا ہے یا

دوسروں سے کسبِ فیض کرتا ہے۔اور مخصوص اور عالی دماغ افراد کے علاوہ جو علمی مراحل میں خود ہی کشف و تحقیق کا کام کرتے ہیں، عام اشخاص دوسروں سے علم حاصل کرتے ہیں' جیسا کہ امام جعفر صادقؑ جو کہ اپنے عہد میں ایک بہت لائق و فائق دانشمند تھے جن سے شیعہ اور دیگر اسلامی فرقوں کے پیرو علم حاصل کرتے تھے۔

امام جعفر صادقؑ نے شیعوں کی مذہبی تہذیب و ادب کی بنیاد صرف ایمان پر نہیں رکھی تھی بلکہ علم کو اس کا ایک اہم رکن قرار دیا تھا۔ آپ نے مذہبِ شیعہ کی بقاء کے لئے جو اصول وضع کئے تھے ان پر یقین بھی رکھتے تھے اور آپ کے اس یقین و ایمان کی دلیل یہ ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دن تک فیض پہنچانے میں مشغول رہے اور جو علوم آپ جانتے تھے وہ دوسروں کو بھی سکھاتے تھے' جب کہ اس سلسلے میں کسی سے ایک پیسہ اجرت نہیں لیتے تھے۔ آپ بغیر کوئی حقِ تعلیم وصول کئے نہ صرف یہ کہ ساری عمر تعلیم و تدریس میں مشغول رہے اور جو علوم آپ کے پاس تھے وہ دوسروں کو سکھاتے رہے بلکہ جو لوگ آپ کی درس گاہ میں علم حاصل کرتے تھے اگر ان میں سے کسی کو ضرورت مند پاتے تھے تو اپنے پاس سے مالی اعانت بھی فرماتے تھے اور وہ بھی اس صورت سے کہ کسی دوسرے شاگرد کو اس کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ آپ پیسوں سے کتابیں خرید کر شاگردوں کو دیتے تھے۔ اگر کسی کتاب کا کوئی نسخہ کسی ایک کے لئے مخصوص ہوتا تھا اور تمام شاگردوں کو اس کے مطالعے کی ضرورت ہوتی تو کاتبوں کو اجرت دے کر اس کے متعدد نسخے تیار کراتے تھے۔

چونکہ امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ میں ایسے علوم کا درس دیا جاتا تھا جو اس سے قبل اسلام میں رائج نہ تھے اور دوسرے لوگوں نے ان پر کتابیں لکھی تھیں۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ ان کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے تاکہ جو شاگرد غیر ملکی زبانیں نہیں جانتے تھے وہ بھی ان سے استفادہ کر سکیں۔اور بعید نہیں ہے کہ عربی زبان میں غیر ملکی کتابوں کے ترجمے کی تحریک جس نے بغداد میں دوسری صدی ہجری سے وسعت پائی اور خلفائے بنی عباس بھی اس کے شائق بنے اور پھر بعض مترجمین کو دردناک طریقے سے

قتل بھی کیا' امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ سے ہی اخذ کی گئی ہو۔

آپ کی درس گاہ میں علمی قوانین کو سمجھنے کے لئے تجربات بھی کئے جاتے تھے۔ فطری طور پر ہم یہ نہیں سوچ سکتے کہ اس عظیم دانشمند کے یہاں دورِ حاضر کی بڑی بڑی تجربہ گاہوں کی مانند کوئی تجربہ گاہ موجود تھی جس میں فزیکی اور کیمیائی قوانین کی آزمائش کی جاتی ہو۔ آپ کی تجربہ گاہ اسی دور کے لحاظ سے تھی لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آپ علوم کے بارے میں صرف تھیوری پر اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ حتیٰ الامکان اسے تجربے کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ اس حقیقت کی طرف متوجہ تھے کہ ہوا ایک عنصر نہیں ہے اور بغیر تجربے کے اس موضوع کی تہہ تک پہنچنا بعید معلوم ہوتا ہے۔

شیعوں کے لئے امام جعفر صادقؑ کا علم کوئی غیر معمولی شئے نہیں ہے کیونکہ وہ آپ کو امامؑ مانتے ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپؑ علمِ امامت سے ہر چیز جانتے تھے۔ اور اسی بناء پر آپ کا کوئی معجزہ بھی ان کی نگاہوں میں بعید از قیاس نہیں ہے چنانچہ آپ کے تمام معجزات کو جو شیعہ مورخین کی کتابوں میں آپ کی طرف منسوب ہیں' بے چون و چرا قبول کر لیتے ہیں لیکن ایک غیر جانبدار مورخ جس وقت امام جعفر صادقؑ کا یہ قول سنتا ہے کہ ہوا بسیط عنصر نہیں ہے بلکہ کئی اجزا سے مل کر بنی ہے جن میں سے ایک جزو اشیاء کو جلانے کا باعث ہوتا ہے نیز بعض اشیاء کو فاسد کرتا ہے تو وہ سمجھنا چاہتا ہے کہ آپ نے کیونکر اس کی تحقیق کی تھی؟

امام جعفر صادقؑ کا معجزہ یہ نہیں تھا کہ آپ پہاڑ کو جنبش میں لے آئے' کیونکہ (مضمون نگار کے خیال میں) یہ عقلی حیثیت سے قابلِ قبول نہیں' بلکہ آپ کا اعجاز یہ ہے کہ آپؑ نے آج سے ساڑھے بارہ سو سال پہلے ہوا میں آکسیجن کی موجودگی کا پتہ لگایا اور اسی موقع پر یہ بھی معلوم کر لیا کہ پانی میں ایک ایسی چیز ہے جو جل جاتی ہے اور اسی بنیاد پر فرمایا کہ پانی آگ میں بدل جاتا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک پیغمبر کا سب سے اہم معجزہ اس کا کلام ہے' مثلاً یہ کہ

وہ بغیر کسی بنیاد کے کوئی بات نہیں کہتے' وہ ہمارے مانند ہیں کیونکہ آج جب ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے کوہِ صفا کو متحرک کردیا تھا اور پہاڑ آپ کے پاس آگیا تھا' تو ہم اس روایت پر یقین نہیں کرسکتے اور ہماری طبیعت قبول نہیں کرتی کہ آپ نے ایسا معجزہ دکھایا ہوگا' لیکن جب ہم یہ سنتے ہیں کہ آپ نے دوسری صدی ہجری کے ابتدائی نصف اول میں آکسیجن نیز پانی کے اندر ہائیڈروجن کے وجود کا پتہ لگالیا تھا تو ہمارا دل تصدیق کرتا ہے کہ یہ اعجاز ہے۔کہا جاتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد کے وسیلے سے جو خود بھی بڑے عالم تھے پانی کے اندر ہائیڈروجن کا پتہ لگایا اور اس کے بعد آپ نے خود معلوم کیا کہ ہوا میں آکسیجن موجود ہے۔ افسوس کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ آیا آپ خالص آکسیجن اور ہائیڈروجن حاصل کرسکے یا نہیں؟ بظاہر خالص ہائیڈروجن اور آکسیجن کا پتہ لگانے کے لئے انہیں حاصل کرنا لازمی ہے اور خالص ہائیڈروجن کا حاصل کرنا خالص آکسیجن حاصل کرنے سے زیادہ دشوار ہے۔ کیونکہ آکسیجن تو خالص حیثیت سے فطرت (ہوا) میں موجود ہے لیکن ہائیڈروجن اس طرح سے نہیں ہے اسی وجہ سے بعد کے زمانوں میں جب تک پانی کا تجزیہ نہیں کیا گیا خالص ہائیڈروجن حاصل نہیں ہوسکی۔

انسان مبہوت ہوجاتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ یا آپ کے والد امام محمد باقرؑ نے ہائیڈروجن گیس کے وجود کا کہ جو خالص طور سے طبیعت کے اندر موجود نہیں ہے اور کوئی رنگ و بو اور ذائقہ بھی نہیں رکھتی ، کیونکر پتہ لگا لیا؟ امام جعفر صادقؑ اور آپؑ کے پدرِ بزرگوار کے لئے ممکن نہ تھا کہ پانی کے علاوہ ہائیڈروجن کا پتہ لگائیں' اور بغیر پانی کا تجزیہ کئے ہوئے اس کی شناخت کرسکیں اور پانی کا تجزیہ بھی برقی رو سے کام لینے پر منحصر تھا۔ کیونکہ کسی دوسرے طریقے سے پانی کا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا تو کیا ان دونوں حضرات میں سے کوئی ایک بھی پانی کے تجزیے کے لئے برقی رو سے استفادہ کرسکتا تھا؟

لیکن یہ بات بھی قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ جدید دور میں سب سے پہلا شخص جو ہائیڈروجن کو پانی سے جدا کرنے میں کامیاب ہوا وہ انگلینڈ کا ہنری کاونڈلیش ہے اور جس

نے اکیاسی سال کی عمر میں ۱۸۱۰ء میں وفات پائی اس نے سالوں پانی پر تجزیہ کی کوشش کی اور ہائیڈروجن حاصل کرنے کے بعد اس کا نام آتش گیر ہوا رکھا۔ جب اس نے پہلی بار ہائیڈروجن کو مشتعل کیا تو قریب تھا کہ خود وہ اور اس کا گھر بھی جل جائے۔ کاونڈلیش نے ۲۷ مئی ۱۷۶۶ء کو ہائیڈروجن سے بھرے ہوئے ایک ظرف کو شعلہ دکھایا تو وہ یکدم جل اٹھا اور پھٹ گیا جس سے چاروں طرف آگ پھیل گئی اور اس کے ہاتھ اور تھوڑا چہرہ بھی جل گیا۔ اگر اس کی چیخ سن کے گھر والے نہ دوڑے ہوتے اور آگ نہ بجھاتے تو اس کا گھر اور تمام اثاثہ سب جل کر خاکستر ہوجاتا۔

اس دانشمند نے دو وجوہ کی بنا پر اس گیس کا نام آتش گیر ہوا رکھا تھا۔ ایک تو یہ کہ ایک تلخ تجربے سے یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ یہ گیس مشتعل ہوجاتی ہے' دوسرے یہ کہ قدماء کے خیال میں پانی ایک سیال ہوا تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ جب پانی کو حرارت پہنچتی ہے تو وہ بھاپ بن کر فضاء میں پھیل جاتا ہے نیز ان کا مشاہدہ تھا کہ پانی بارش کی صورت میں فضاء سے نیچے آتا ہے لہٰذا سوچتے تھے کہ پانی سیال ہوا کے سوا اور کچھ نہیں اور اسی بناء پر کاونڈلیش نے اس گیس کا نام آتش گیر ہوا رکھا۔

ہائیڈروجن کا نام عربی زبان میں مولدا لماء (یعنی پانی پیدا کرنے والی) ہے۔ یہ نام مشہور فرانسیسی دانشمند لاوازیہ نے جسے گلوٹین سے قتل کیا گیا' تجویز کیا تھا اور لاوازیہ نے یہ نام جب تک وضع نہیں کیا یورپی ممالک میں اسے آتش گیر ہوا ہی کہا جاتا تھا۔ ہائیڈروجن گیس کا انکشاف اس زمانے میں ہوا جب برقی طاقت کا استعمال اس قدر ترقی کرچکا تھا کہ اس کے ذریعے پانی کا تجزیہ کیا جاسکے۔

البتہ امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں برقی قوت سے صرف کہربا اور کاہ (گھانس) کی حد تک کام لیا جاتا تھا۔ جس کا مقصد شعبدہ بازی اور بازی گری تھا۔ کہربا کے ایک ٹکڑے کو اونی کپڑے پر رگڑ کر اسے گھانس کے قریب لے جاتے تھے تو کہربا گھانس کی پتیوں کو کھینچ لیتا تھا۔

آیا امام جعفر صادقؑ یا ان کے والدِ بزرگوار امام محمد باقرؑ نے ہائیڈروجن کو پانی سے

الگ کرنے کا کوئی ایسا طریقہ دریافت کرلیا تھا جس سے اب بھی ماہرین ناواقف ہیں۔ اور وہ برقی رو کے علاوہ کسی اور ذریعے سے ہائیڈروجن کو پانی سے جدا کرنے پر قادر ہوگئے تھے۔ جس روز سے کاونڈیش پہلی بار ہائیڈروجن کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا آج تک علماء اور دانشمند اس ذریعے کے علاوہ کسی اور طریقے سے ہائیڈروجن کو پانی سے جدا نہیں کرسکے۔

گزشتہ چند برسوں میں فضائی آلودگی کو دیکھتے ہوئے خاص طور پر امریکہ میں جہاں انرجی کی بہت ضرورت رہتی ہے اس بات پر غور کیا جارہا ہے کہ برقی رو سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ پانی کے تجزیے کا کوئی اور طریقہ ایجاد کیا جائے' لیکن ابھی تک اس کی تحقیق میں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔(۱)

اسی بناء پر امام محمد باقرؑ یا ان کے فرزند امام جعفر صادقؑ نے جب ہائیڈروجن کی تحقیق کی تو پانی پر تجزیہ کے لئے برقی رو سے کام لیا یا کسی ایسے طریقے سے جس کا علم ابھی تک ماہرین کو نہیں ہوسکا ہے' خالص ہائیڈروجن حاصل کی (اور بقول مضمون نگار) کیونکہ یہ دونوں حضرات صرف فلسفے کے سہارے اس کا پتہ نہیں لگا سکتے تھے۔

یونانی اور اسلامی قوموں کے نظم و نثری ادب میں کچھ مضامین "آبِ آتش ریز" یا "آبِ آتش افروز" کے عنوان سے نظر آتے ہیں لیکن ان کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ پانی میں آگ کی خاصیت موجود ہے بلکہ وہاں شراب کے معنی مراد ہیں جو پینے کے بعد شرابی کو گرم کردیتی ہے اور کسی زمانے میں کسی فلسفی سے یہ نہیں سنا گیا کہ پانی آگ پیدا کرتا ہے۔ یہ مضمون صرف امام جعفر صادقؑ کے بعد بعض حکماء اور عرفاء سے سنا گیا اور

۱۔ اخبارات کے مطابق امریکی صدر نکسن نے حکم دیا ہے کہ سائنس دان انرجی کے نئے منابع کے حصول کے لئے تحقیقات کا آغاز کریں۔ انرجی کا ایک بڑا اور نہ ختم ہونے والا منبع ہائیڈروجن ہے اور قوی احتمال ہے کہ امریکی سائنس دان بجلی یا پانی کے تجزیئے کے ارزاں اور آسان ذریعے سے ہائیڈروجن حاصل کرنے کے طریقوں پر تحقیق کریں گے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ان سب نے آپؑ سے یا آپؑ کے شاگردوں سے کسبِ فیض کیا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ صدیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے عزم و ہمت سے بعض علمی رازوں کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے لیکن ان کا انکشاف بعد میں آنے والی نسلوں تک نہیں پہنچا۔کیونکہ جو کچھ انہوں نے دریافت کیا تھا اسے ضبطِ تحریر میں نہیں لائے تاکہ نسل در نسل باقی رہے' نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی زحمتیں طاقِ نسیان کی نذر ہوگئیں۔ بعض اشخاص نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اپنے انکشافات سے دوسروں کو آگاہ کریں کیونکہ اس طرح علم نااہل افراد تک پہنچ سکتا تھا اور وہ اسے لوگوں کی ایذا رسانی کے لئے استعمال کرسکتے تھے۔

کتاب"اموات"میں جو ایک بہت قدیم کتاب ہے اور مصر میں لکھی گئی ہے۔ اور پوری کتاب موجود بھی نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ حصے باقی رہ گئے ہیں سفارش کی گئی ہے کہ علم نااہل افراد کو نہ سکھایا جائے کیونکہ وہ اس سے خداؤں اور انسانوں کو ضرر پہنچانے کا کام لیں گے۔

چین کے کنفیوشس (Confucius) نے جس نے ۴۷۶ قبل مسیح میں ۷۲ سال کی عمر میں انتقال کیا اور جو ہمارے علم کے مطابق درباری کارندہ اور ایک معلمِ اخلاق تھا' چنانچہ آج بھی چین میں اس کی تعلیمات مقبول ہیں اور اس کی کتابیں چھاپی جاتی ہیں' سفارش کی ہے کہ بعض علمی اسرار جن سے لوگوں کی ضرر رسانی میں کام لیا جاسکتا ہے' ایسے افراد کو جن سے خطرہ ہو کہ وہ انہیں لوگوں کو نقصان پہنچانے میں استعمال کریں گے نہ سکھائے جائیں' کیونکہ ایسے لوگ خود اپنی نوع کی تباہی اور بدبختی کا باعث بن جاتے ہیں یہ معلمِ اخلاق جس نے تعلیم دی ہے کہ دوسروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرو جیسا کہ تم دوسروں سے اپنے لئے چاہتے ہو' بعض علمی اسرار کا نااہلوں کے ہاتھوں میں پڑنا خطرناک سمجھتا ہے۔

یہاں تک کہ تصوف و عرفان کے فرقوں میں بھی جن چیزوں کو اسرار میں شمار کیا

جاتا تھا انہیں اپنے اکثر مریدوں کو نہیں سکھاتے تھے۔ باوجودیکہ تصوف کی بحثوں اور عرفانی افکار میں فزکی قوتیں موجود نہیں ہیں جن کے نااہل افراد کے ہاتھوں میں پہنچ جانے سے لوگوں کے لئے کوئی خطرہ درپیش ہو' پھر بھی ان کے یہاں اقطاب کی طرف سے بعض اسرار کی حفاظت واجبات میں سے تھی' تاکہ نااہلوں تک نہ پہنچیں۔ ان میں سے کچھ فرقوں میں مراحلِ سلوک یعنی تعلیم و تربیت کے مدارج کے سات مرحلے تھے اور جب مرید یہ ساتوں مراحل طے کرلیتا تھا تو مربّی یا قطب کے نزدیک اس لائق قرار پاتا تھا کہ بعض اسرار سے آگاہ ہو' درحالیکہ یہ طے شدہ ہے کہ وہ اسرار فزکی یا کیمیائی یا میکانکی قوانین نہیں تھے جن سے کوئی شخص قوم کو نقصان پہنچانے یا اپنے فائدے کے لئے کام لے سکے۔ یہ فقط چند نظریات تھے جن سے نااہل افراد کی آگاہی کو مرشد اجتماعی یا اخلاقی لحاظ سے خطرناک سمجھتا تھا۔

مذکورہ بالا گفتگو کے پیشِ نظر آیا امام جعفر صادقؑ جانتے تھے کہ بغیر برقی رو سے استفادے کے ہائیڈروجن کو پانی سے جدا کرنا اور اسے خالص حیثیت سے حاصل کرنا کیونکر ممکن ہے؟ اور اسے نااہل سے پوشیدہ رکھنا چاہئے۔

مسلمان عام طور پر اور شیعہ خاص طور سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایسے رموز و اسرار موجود ہیں جن سے پیغمبرِ اسلامؐ اور مذہبِ شیعہ کے بارہ ائمہؑ ہی آگاہ تھے لیکن ان کا اظہار اس لئے نہیں کیا کہ یہ حضرات جانتے تھے کہ اگر انہیں ظاہر کردیا جائے تو قوم اور جماعت کا شیرازہ درہم برہم ہوجائے گا'یا یہ کہ اس طرح یہ راز نااہلوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے اور وہ لوگ ان سے انسانوں کو ستانے اور نظم و نسق میں خلل ڈالنے کا کام لیں گے۔

اگر امام جعفر صادقؑ ہائیڈروجن حاصل کرنے کے لئے تجزیہء آب کے طریقے سے واقف تھے لیکن اسے بیان کرنے سے احتراز کیا'تو ماننا پڑے گا کہ آپؑ نے بہت نیک کام انجام دیا کیونکہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ پانی سے ہائیڈروجن کو الگ کرنے کا عمل بجائے اس کے کہ انسانی زندگی کی فلاح و بہبود میں مددگار ثابت ہو' ہائیڈروجن بم کی

ایجاد کا ذریعہ بن گیا ہے اور یہ مہلک جنگی اسلحہ موت کی طرح انسانوں کے سروں پر معلق ہے جو کسی وقت بھی گر کر پھٹ سکتا ہے اور انسانی آبادی کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔

---☆---☆---

روشنی کا نظریہ اور امام جعفر صادقؑ

امام جعفر صادقؑ کی علمی اختراعات میں سے ایک روشنی کے بارے میں آپ کا نظریہ ہے۔آپ نے فرمایا ہے کہ نور دیگر اشیاء کی طرف سے ہماری آنکھ کی جانب آتا ہے اور اس میں سے صرف ایک ہی حصہ ہماری آنکھ میں چمکتا ہے جس کی وجہ سے ہم دور کی چیزوں کو بخوبی نہیں دیکھ سکتے۔ اگر وہ تمام نور جو کسی دور کی چیز سے ہماری آنکھ کی طرف آتا ہے دیدے کے اندر پہنچ جائے تو ہمیں دور کی چیز قریب نظر آئے گی۔ اگر کوئی ایسا آلہ بنایا جاسکے جس کے ذریعے دور کی چیز سے آنے والا تمام نور آنکھ کے اندر چمکا دیا جائے تو صحرا کے اندر جو اونٹ تین ہزار گز کے فاصلے پر چر رہا ہے اسے ہم ساٹھ گز کے فاصلے پر دیکھیں گے یعنی وہ ہمیں پچاس گنا قریب نظر آئے گا۔

یہ نظریہ امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں کے ذریعے ہر طرف پھیل گیا اور جب صلیبی جنگوں کے بعد مشرق و یورپ کے درمیان تعلقات قائم ہوئے تو یورپ میں منتقل ہوگیا اور وہاں کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا جانے لگا۔ اس نظریئے کا ایک مشہور مدرّس انگلینڈ کی آکسفورڈ یونیورسٹی کا استاد ڈاکٹر راجر بیکن بھی تھا۔ نور کے بارے میں اس کی تھیوری بھی وہی ہے جو امام جعفر صادقؑ نے بتائی تھی۔ اور آپ کی مانند اس نے بھی یہی کہا ہے کہ اگر ہم کوئی ایسا آلہ بنائیں جو دور کی تمام اشیاء کا نور ہماری آنکھوں میں پہنچا دے تو ہم ان اشیاء کو پچاس گنا زیادہ قریب دیکھیں گے۔

اسی نظریئے کی بناء پر ۱۶۰۸ء میں لپرشی فلا مانڈی (LIPPERSHEY) نے پہلی دوربین ایجاد کی اور اسی نمونے کو سامنے رکھ کر مشہور سائنس دان گیلیلو اپنی فلکی دوربین بنانے میں کامیاب ہوا۔ اسی نے اپنی اس دوربین سے ۱۶۱۰ء کے پہلے مہینے یعنی ۷جنوری کی شب میں کام لیا اور آسمانی ستاروں کا مشاہدہ کیا۔

جیسا کہ ہمارے پیشِ نظر ہے تاریخ میں اس کے موجد لپرشی اور گیلیلو کے دوربین بنانے کے درمیان دو سال سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔ اور چونکہ گیلیلو نے ۱۶۱۰ء کے پہلے ہی مہینے میں اپنی دوربین سے کام لینا شروع کردیا تھا لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ یہ فاصلہ دو سال سے بھی کم ہے اور اس طرح بعید نہیں کہ فلکی دوربین بنانے کا خیال ایک ہی موقع پر دونوں کے ذہن میں آیا ہو۔

البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گیلیلو نے لپرشی کی دوربین سے رہنمائی حاصل کی اور جو نقص اس میں باقی رہ گیا تھا اسے اس زمانے کے ٹیکنکی امکانات کی حدود میں رفع کرکے اس سے ۷جنوری ۱۶۱۰ء کی شب میں آسمان کا نظارہ شروع کیا۔

گیلیلو ملک پاٹا ویوم کی مشہور یونیورسٹی کا تربیت یافتہ تھا جو بعد میں (وینس) (VENICE) سے موسوم ہوئی اور آج اس کی کرسی کو وینس کہتے ہیں اور اسے مشرقی پاٹاویوم یا ونی ئی میں بندقیہ کہا جاتا تھا۔ گیلیلو ریاضی کا استاد بن گیا۔ جب اس نے پہلی شب اپنی دوربین کا رخ چاند کی طرف کیا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ زمین کی طرح چاند پر بھی پہاڑوں کا ایک سلسلہ موجود ہے اس نے دیکھا کہ یہ پہاڑ، چاند کے صحراؤں پر سایہ ڈال رہے ہیں۔ چنانچہ اس کی سمجھ میں آیا کہ دنیا صرف زمین ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ چاند بھی ایک دنیا ہے۔

اگر نور کی تھیوری امام جعفر صادقؑ کی طرف سے پیش نہیں کی گئی ہوتی تو کیا لپرشی فلامانڈی اور گیلیلو فلکی دوربین بناسکتے تھے؟ گیلیلو نظامِ شمسی کے اجرام کا مطالعہ کرسکتا تھا؟ اور اپنے مشاہدے سے کوپرنیک اور کیپلر کے اس نظریئے کی تائید کرسکتا تھا کہ نظامِ شمسی کے اجرام جن میں زمین بھی شامل ہے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔

گیلیلو کی طرف سے دوربین کی ایجاد نے لوگوں کو اس قدر متاثر کیا کہ وینس کے ممبرانِ پارلیمنٹ سے صدرِ جمہوریہ تک سبھی اس کے ذریعے ستاروں کا معائنہ کرنے کے شائق بن گئے۔ گیلیلو اپنی دوربین کو پادو سے جہاں مشہور یونیورسٹی تھی اور ہے' وینس لے آیا اور اسے ایک کلیسا کے بُرج پر نصب کیا۔ عمر رسیدہ سینیٹرز بھی سہارا دے کر اس بُرج تک پہنچائے گئے تاکہ وہاں سے اس دوربین کے ذریعے چاند اور ستاروں کو دیکھ سکیں۔

جب گیلیلو سے پوچھا جاتا تھا کہ اس کی دوربین اجرامِ فلکی کو اس قدر قریب کس طرح کردیتی ہے کہ اس سے چاند کے پہاڑ بھی دیکھے جاسکتے ہیں؟ تو وہ امام جعفر صادقؑ کی پیش کی ہوئی تھیوری دہراتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ دوربین اجرامِ سماوی کے اس سارے نور کو جو آنکھوں کی طرف آتا ہے جمع کرلیتی ہے اور اس کے نتیجے میں جو چیز تین ہزار قدم کے فاصلے پر ہو وہ اس قدر نزدیک آتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ساٹھ قدم کے فاصلے پر ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ گیلیلو کی ایجاد کے بعد جب عطارد' زہرہ اور مشتری کے چاندوں کے مراحل آنکھوں سے دیکھے گئے تو کوپرنیک اور کپلر کے نظریئے کی تائید میں اس نے کیا اثرات مرتب کئے۔

یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ معروف حکیم اور مشہور مشائی فلسفے کے حامل ارسطو اور اس کے پانچ سو سال بعد آنے والے بطلیموس نے تیسری صدی قبلِ مسیح سے پندرھویں صدی عیسوی تک یعنی اٹھارہ سو سال کی مدت تک علمِ نجوم کو پیچھے دھکیل دیا۔

اریس تارخوس جیسے چند حکماء نے یہ کہا تھا کہ زمین اپنے گرد اور ساتھ ہی سورج کے گرد گھومتی ہے۔ چنانچہ اپنے گرد زمین کی گردش سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں اور سورج کے گرد زمین کی گردش سے سال کے موسم۔

ارسطو ایک مفکر اور عظیم فلسفی تھا اور اس کی کتابیں "کانون" اور "فزکس" وغیرہ

علم و ادب کی زندہ و جاوید کتب شمار کی جاتی ہیں لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ہیئت کے بارے میں اس نے اٹھارہ سو سال تک بشریت کو جہالت کے اندھیرے میں رکھا ـــــ اور انسان کو اس کا موقع نہیں دیا کہ اپنے کو اس ظلمت کدے سے نجات دے اور جرأت سے کہا جاسکتا ہے کہ ارسطو نے اتنے طویل عرصہ تک ہماری علمی پیشقدمی کو روکے رکھا۔ اگر وہ یہ نہ کہتا کہ زمین ساکن اور ثابت ہے اور سورج اور دیگر ستارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں تو نمایاں علمی ترقی جو عہدِ جدید میں یورپ میں ہوئی ہے کم ازکم پہلی صدی عیسوی سے شروع ہوچکی ہوتی۔ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دورِ جدید میں یورپ کا یہ علمی ارتقاء جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے' کوپرنیک لہستانی نے شروع کیا جس نے کہا تھا کہ زمین' سورج کے گرد گھومتی ہے اس کے بعد جرمنی کے کپلر نے اس کو تقویت دی' جس نے سیاروں کی جن میں زمین بھی شامل ہے' سورج کے گرد حرکت کے قوانین کا انکشاف کیا۔ اسے بعد میں گیلیلیو نے مزید تقویت پہنچائی جس نے سورج کے گرد سیارات کی حرکت کو محسوس اور چشم دید طریقے سے ثابت کیا۔ اگر یہ تینوں افراد پیدا نہ ہوتے اور چالیس ہزار آٹھ سو سالہ نوعِ بشر کو زمین کے ثبات اور اس کے گرد سورج کی گردش کے نظریئے سے الگ نہ کرتے تو ڈیکارٹ وجود میں نہ آتا جو اپنے ایجاد کردہ طریقے (Method) کے ذریعے جدید علمی تحقیقات کی بنیاد مضبوط کرتا۔ اس طرح وہ بھی دوسرے ان دانشمندوں کی طرح سترھویں صدی سے کوپرنیک کی آمد کے دور تک جہالت کے اندھیرے میں رہتے جو ارسطو کا پیدا کیا ہوا تھا۔

جس وقت گیلیلیو نے ۱۶۱۰ء میں پہلی بار اپنی فلکی دوربین کا رخ آسمان کی طرف کیا تو ڈیکارٹ چودہ سال کا تھا اور وہ کوپرنیک' کپلر اور گیلیلیو کے بغیر خود کو جہالت کے اندھیرے سے نکال کر عہدِ جدید کی علمی تحقیق کی بنیاد استوار نہیں کرسکتا تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ علوم زنجیر کے حلقوں کی مانند ہیں' لیکن ایک حلقہ دوسرے حلقے سے ملحق ہوتا ہے اور ایک علم سے دوسرا علم دریافت ہوتا ہے۔ سورج کے گرد سیارات اور زمین کی حرکت کے موضوع پر نوع بشر کی جہالت نے جس کا باعث ارسطو بنا اٹھارہ

صدیوں تک علمی فضا میں انسان کے پر پرواز کو معطل رکھا اور بزرگ استاد و معلم ارسطو کا اثر و نفوذ اتنا زیادہ تھا کہ کوئی شخص اس کے نظریئے کو باطل کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

اقوامِ عالم میں ارسطو کے نظریہ کو دو اور چیزوں کی وجہ سے بھی تقویت حاصل ہوئی۔ اوّل یہ کہ مصر کے مشہور جغرافیہ داں بطلیموس نے جو ارسطو کے پانچ سو سال بعد آیا اس کے نظریئے کو درست قرار دیا اور ستاروں کی حرکات کے سلسلے میں یہ نظریہ پیش کیا کہ سیارے ایسی چیزوں کے گرد گھوم رہے ہیں جو متحرک ہیں اور چیزیں زمین کے گرد گھومتی ہیں لیکن زمین بے حس و ساکت ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں' بطلیموس نے زمین کے گرد سیاروں کی گردش کے دو درجے قرار دیئے ہیں اور کہا ہے کہ یہ چند چیزوں کے گرد گردش کرتے ہیں اور وہ چیزیں اپنی جگہ پر ثابت و ساکن زمین کے گرد گھومتی ہیں۔

دوسری چیز یہ کہ یورپ میں مسیحی کلیسا نے ارسطو کے نظریئے کی تائید کی اور کہا کہ ارسطو نے زمین کے ساکت اور مرکزِ عالم ہونے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بلاشبہ ایک حقیقت ہے' کیونکہ اگر زمین ساکت اور مرکزِ عالم نہ ہوتی تو خدا کے بیٹے حضرت مسیحؑ اس میں ظاہر نہ ہوتے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کوپر نیک' کپلر اور گیلیلیو پیدا نہ ہوتے تو ڈیکارٹ پیدا ہوتا جو جدید علمی تحقیق کی بنیاد رکھتا اور اس کے بعد بھی علم کی پیش رفت ہوتی' یہاں تک کہ آج کے موجودہ مرحلے تک پہنچ جاتا۔ البتہ دورِ حاضر کے دانشمند اس نظریئے کے حامی نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک اس صدی کے نیمہ اوّل کا برطانوی ماہرِ طبیعیات ایڈنگٹن ہے جس نے ۶۲ سال کی عمر میں ۱۹۴۴ء میں وفات پائی۔

جس شخص نے بھی فزکس پر کام کیا ہے وہ ایڈنگٹن سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ موجودہ صدی میں فزکس کی ترقی میں اس کا کتنا حصہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ارسطو کا (مذکورہ بالا) نظریہ جس کی بعد میں بطلیموس نے توثیق کی سولہویں صدی عیسوی تک علم پر کابوس

کی مانند چھایا رہا' اس کا گلا گھونٹتا رہا اور اسے سانس لینے کا موقع نہیں دیا۔ اگر یہ کابوس دُور نہ ہوتا اور علم آزادی کی فضا میں سانس نہ لے سکتا تو دورِ حاضر میں ہمیں کوئی علمی پیش رفت نصیب نہ ہوتی۔

مشرق کے اہلِ قلم اور دانشوروں میں بھی کچھ لوگ اسی نظریئے کے حامل ہیں جن میں سے ایک ہندوستان کے چاترجی ہیں۔ ان کا قول ہے کہ اگر انسان زمین کی اپنے اور سورج کے اطراف میں حرکت کا پتا نہ لگاتا تو جہالت میں مبتلا رہتا اور دورِ جدید کی علمی کامیابیوں سے محروم رہ جاتا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ مسیحی کلیسا نے ارسطو اور بطلیموس کے اس نظریئے کی تائید کی تھی کہ زمین ساکت اور مرکزِ عالم ہے' اس کی نظر میں اگر زمین ساکت اور مرکزِ عالم نہ ہوتی تو خدا کا بیٹا (مسیح) اس میں ظہور نہ کرتا' اس لئے کہ خدا کا بیٹا اسی جگہ ظاہر ہوتا ہے جہاں مرکزِ عالم اور ثابت ہو۔ اور جو زمین ایسی نہ ہو تو وہ اس کی اہل نہیں۔ باوجود یہ کہ مسیحی کلیسا نے زمین کے ثبات اور اس کی مرکزیت کی تائید کی اور اسے عیسائی مذہب کا جزو بنالیا لیکن دانشور طبقہ ارسطو کے نظریئے کا سہارا لیتا تھا اور جب یہ لوگ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ زمین مرکزِ عالم اور ساکت ہے تو یہ نہیں کہتے تھے کہ مذہب بتاتا ہے بلکہ یہ کہتے تھے کہ ارسطو نے یہ کہا ہے۔

اگر کوپرنیک' کپلر اور گیلیلیو' ارسطو کی غلطی کی اصلاح نہ کرتے اور اس کے اس نظریئے کو غلط ثابت نہ کرتے تو آج بھی اگر کوئی شخص کسی بات کو ثابت کرنا چاہتا اور ارسطو نے بھی اس سے متعلق اپنے نظریات کا اظہار کیا ہوتا تو یہی کہتا کہ ارسطو نے ایسا کہا ہے' کیونکہ اس کا قول حجت تھا اور کسی کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کے آثار و اقوال میں کوئی چیز ایسی بھی ہے جو درست نہیں ہے بالخصوص ثباتِ زمین اور اس کی مرکزیت کے بارے میں ارسطو کا نظریہ اسی دلیلِ مرکزیت کے ساتھ پہاڑ کے مانند غیر متزلزل نظر آتا تھا۔

انسان کی معنوی زندگی میں اور بھی غلط نظریات موجود تھے (حالانکہ ایسی صورت

میں انہیں علمی نظریہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ کسی نظریئے کے علمی ہونے کے لئے اس کی صحت ضروری ہے) اور شاید آج بھی موجود ہیں۔ لیکن کسی غلط نظریئے نے ارسطو کے اس نظریئے کی طرح علم' عقل و ادراک پر اپنا سایہ نہیں ڈالا' یہاں تک کہ انسانی عقل اور علمی ادراک اٹھارہ صدیوں تک محکوم بنا رہا۔اس طویل مدت میں جب مسیحی کلیسا بھی ارسطو کے نظریئے کو رسمی طور پر قبول کرتا تھا' کلیسا والوں میں صرف ایک شخص ایسا پیدا ہوا جس نے اس کی مخالفت کی اور وہ نیکولا ڈوکوزا ہے۔ جو کیتھولک کلیسا میں کارڈینال(CARDINAL) کے عہدے پر فائز تھا۔ اس کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ یہ یونان کے قدیم حکماء کی کتابیں پڑھنے کا شائق تھا۔

وٹیکن کا کتب خانہ علمی اور ادبی لحاظ سے یورپ اور امریکہ والوں پر بڑا حق رکھتا ہے' کیونکہ یونان اور قدیم روم کے معارف و معلومات کا ایک بہت بڑا حصہ اسی کے ذریعے یورپ اور امریکہ تک پہنچا۔ یورپ میں چند دوسرے کتب خانے بھی تھے جنہوں نے ان علوم کو منتقل کرنے میں حصہ لے کر اہلِ یورپ پر احسان کیا ہے۔ البتہ ان میں سے کوئی کتب خانہ وٹیکن سے زیادہ اپنا حق نہیں رکھتا۔ کیونکہ اگر یہ کتب خانہ نہ ہوتا تو یونان اور قدیم روم کے بہت سے معارف مخفی رہ جاتے۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یورپ ہمیشہ میدانِ جنگ بنا رہا اور جو لوگ جنگ میں مصروف تھے وہ کتاب کی اہمیت کے قائل نہیں تھے۔ وہ کتابوں کو جلا دیتے تھے یا ویران کھنڈروں میں دفن کردیا کرتے تھے۔ البتہ جو کتابیں وٹیکن میں تھیں وہ چند دیگر مذہبی مراکز کی کتابوں کی طرح دو وجوہات سے باقی اور محفوظ رہ جاتی تھیں۔ اوّل یہ کہ جنگجو افراد چونکہ عیسائی تھے اور ان مراکز کو مقدّس مانتے تھے لہٰذا ان پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ دوسری یہ کہ ان مراکز میں رہنے والے علم دوست تھے اور کتابوں کی قدر جانتے تھے' ان کی حفاظت کرتے تھے اور گردو غبار یا حشرات الارض کے ہاتھوں انہیں برباد نہیں ہونے دیتے تھے۔

یورپ کی قدیم درس گاہیں' جیسے اٹلی کی "پاڈو" انگلستان کی "آکسفورڈ" اور فرانس

کی "ساربون" یونان اور قدیم روم کی علمی و ادبی میراث کی حفاظت کے لحاظ سے صفِ اول میں شمار نہیں کی جاتیں تھیں کیونکہ یہ تمام درس گاہیں دس عیسوی صدیاں گزر جانے کے بعد وجود میں آئیں اور انہوں نے ویٹیکن اور یورپ کے دیگر مذہبی مراکز کے کتابی خزانوں سے استفادہ کیا۔ پہلی دس صدیوں میں صرف ویٹیکن اور دوسرے مذہبی مراکز ہی کتابوں کے محافظ تھے۔

یورپ کے امراء اور سلاطین جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ سبھی اَن پڑھ تھے۔ کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ بعض ادوار میں تو بادشاہوں اور امراء و اشراف کے لئے پڑھنا لکھنا ایک بڑا عیب اور باعثِ ننگ و عار تھا۔ جب بادشاہ اور امراء ان پڑھ ہوں تو ظاہر ہے کہ عام آدمی کی تعلیمی حالت کیسی ہوگی؟

یورپ میں تعلیمی مراکز اور کتاب پڑھنے یا محفوظ رکھنے کے مقامات صرف دینی مراکز تھے۔ اور اگر یہ مراکز یونانی' لاطینی اور سریانی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کی حفاظت نہ کرتے تو یونان اور قدیم روم کے علوم موجودہ یورپی اقوام تک نہ پہنچتے۔

ویٹیکن کا کتب خانہ یونانی' قدیم یونانی اور لاطینی کتابوں کا مالک ہونے کی وجہ سے دیگر مذہبی مراکز کے کتب خانوں کے مقابلے میں زیادہ مستغنی تھا۔ البتہ معمولی علماء کا وہاں گزر نہ تھا صرف اسقف اور کارڈینل جو کلیسا کے امراء کہے جاتے تھے اس میں داخل ہوسکتے اور کتابوں سے استفادہ کرسکتے تھے۔

آج اس کتب خانے میں ہر عیسائی عالم آزادی سے جاسکتا ہے چاہے وہ ابتدائی درجے کا پادری ہو۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ گزشتہ دور میں کیتھولک کلیسا کے اندر بھی علمی حیثیت سے امتیاز برتا جاتا تھا اور جو پادری نچلے درجے کے ہوتے تھے انہیں ویٹیکن کے کتب خانے میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

انہیں اجازت نہ دینے کا ظاہری سبب تو یہ تھا کہ ان کے قول کے مطابق جو پادری نچلے درجے کے ہیں ان کے پاس اتنا علم ہی نہیں ہے کہ ویٹیکن کی کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں' لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ کلیسا کے امراء اور چھوٹے پادریوں کے درمیان حدِ

فاصل قائم کی جائے' کیونکہ امراء یہ نہیں چاہتے تھے کہ چھوٹے پادری کتب خانے کے اندر ان کے پہلو میں آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر کتاب کا مطالعہ کریں۔ اس کتب خانے کی کتابیں کسی شخص کو عاریتاً" نہیں دی جاتی تھیں کہ وہ اپنے گھر لے جاکر اطمینان سے مطالعہ کرسکے اور ان کتابوں کے غائب نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انہیں باہر لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ آج بھی انہیں کسی کو عاریتاً نہیں دیا جاتا' صرف ان کی کاپی کو باہر بھیجا جاتا ہے۔

نیکولا ڈوکوزا چونکہ امراء کلیسا میں سے تھا لہٰذا کتب خانے کے اندر جاکر اس کی قدیم کتابوں سے استفادہ کرسکتا تھا۔ یہ قدیم یونانی زبان بھی جانتا تھا لہٰذا اس نے زمین کی وضعی اور انتقالی حرکات کے بارے میں ارسٹارخوس جیسے قدیم یونانی حکماء کے نظریئے سے آگاہی حاصل کی' اس کے بعد وٹیکن سے اپنے روحانی مرکز جرمنی پلٹ آیا۔

اس نے جرمنی میں زمین کی حرکتِ وضعی و انتقالی کی تشریح لکھی جو ایک رسالے کی صورت میں شائع ہوئی۔ اس دور میں طباعت کی صنعت اس قدر عام نہیں تھی کہ نیکولا ڈوکوزا اسے چھپوالیتا لہٰذا اس کی اشاعت پرانے طریقے پر ہوئی اور جو شخص اس رسالے کا شائق ہوتا تھا وہ اس کی نقل کرلیتا تھا۔

نیکولا ڈوکوزا نے یہ رسالہ ۱۴۶۰ء میں (کوپرنیک کی ولادت سے ۱۳ سال قبل) شائع کیا اور اس میں کہا کہ زمین ساکت نہیں ہے بلکہ اپنے گرد اور سورج کے گرد گھومتی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ گردشِ زمین کا اعلان اس کے نام سے نہ ہوا بلکہ کوپرنیک لہستانی کے نام سے ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نیکولاڈوکوزا ایک مذہبی عالم تھا اور علمِ نجوم و ریاضی سے نابلد تھا جب کہ کوپرنیک ایک منجم اور ریاضی داں تھا اور اس نے زمین کی حرکت کو علمی طور پر ثابت کیا تھا۔

نیکولاڈوکوزا نے قدیم حکمائے یونان کا جو نظریہ معلوم کیا تھا اسے بغیر علمی استدلال کے دہرایا۔ چونکہ اس کا رسالہ دلیل سے عاری تھا لہٰذا یہ روحانی مرکز سے باہر اثر انداز

نہیں ہوسکا۔ اور ویٹیکن کو متوجہ نہ کرسکا۔

قوی احتمال یہی ہے کہ جن لوگوں نے اس کے رسالے کو پڑھا انہوں نے اس کے قول پر یقین نہ کرتے ہوئے اسے محض ایک شوخی سمجھا۔ نیکولاڈوکوزا کی تحریر اس لئے ایک شوخی معلوم ہوتی تھی کہ اس میں بدیہیات کا انکار کیا گیا تھا۔ یعنی ایسی چیز کا انکار جس کے وجود میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

ریاضیات کے بابا آدم فیثا غورث نے اپنے مقدمہ ہندسہ میں ایک اصول کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ بدیہی مسائل میں سے ہے جس کے اثبات کی ضرورت نہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ دس عدد پانچ سے زیادہ ہوتے ہیں اور یہ ایسا بدیہی مسئلہ ہے کہ اسے ثابت کرنے کے لئے ہمیں دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح پانچ رطل چار رطل سے زیادہ وزنی ہوتے ہیں اور اس کے بدیہی ہونے کی وجہ سے اس پر دلیل قائم کرنا ضروری نہیں۔ اسی طرح سورج اور ستاروں کی حرکت محتاجِ ثبوت نہ تھی کیونکہ آغازِ خلقت ہی سے نوعِ بشر اپنی دونوں آنکھوں سے برابر دیکھ رہی تھی اور دیکھ رہی ہے کہ سورج اور ستارے زمین کے گرد گھوم رہے ہیں۔

زمین کا ساکت اور غیر متحرک ہونا بھی ایک دوسرا بدیہی مسئلہ نظر آتا تھا کیونکہ انسانوں نے کبھی یہ نہیں دیکھا تھا کہ زمین چل رہی ہے اور جب کوئی مضبوط عمارت بناتے تھے تو جانتے تھے کہ یہ صدہا سال قائم رہے گی اور اگر منہدم ہوگی تو بادوباراں وغیرہ کی وجہ سے نہ کہ زمین کی حرکت کے باعث۔

اگر کوئی شخص کسی مقام پر کوئی ٹیلہ یا پہاڑ دیکھتا ہے اور پچاس سال اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے کے بعد پھر واپس آتا ہے تو وہ ٹیلہ یا پہاڑ کو اسی جگہ پاتا ہے اور اسے وہ وہاں سے ہٹا ہوا نظر نہیں آتا۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص کہے کہ زمین ساکت نہیں ہے بلکہ حرکت کررہی ہے اور وہ بھی دُہری حرکت تو یہی کہا جائے گا کہ اس کے دماغ میں خلل ہے یا شوخی اور مزاح کررہا ہے۔

نیکولاڈوکوزا چونکہ ایک محترم مذہبی عالم تھا اور اسے دیوانہ نہیں کہا جاسکتا تھا لہٰذا یہی کہا گیا کہ تمسخر اور شوخی کررہا ہے۔ اس کے رسالے کا عوام پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ عوام اس زمانے میں کتاب اور رسالہ پڑھتے ہی نہیں تھے اور خواص پر بھی یہ اثر ہوا کہ وہ سوچنے لگے کہ مصنف اس قدر بدیہی حقیقت کا انکار کرکے لوگوں سے مزاح کرنا چاہتا ہے۔

اس کے باوجود اگر وہ رسالہ نیکولاڈوکوزا کی زندگی میں ویٹیکن پہنچ جاتا تو اس کے لئے ایک مشکل کھڑی کردیتا' یہاں تک کہ ہوسکتا تھا کہ اس کا ارغوانی رنگ کا مخصوص لباس اور کلاہ بھی چھن جاتی اور وہ کارڈینل کے بلند عہدے سے جو کیتھولک کلیسا کا دوسرا بڑا منصب تھا معزول ہوجاتا۔

مذکورہ بالا بیان کی بناء پر امام جعفر صادقؑ کا نظریہ نور جب صدیاں گزرنے کے بعد فلکی دوربین بنا سکنے اور اس کے ذریعے اجرامِ سماوی کا مطالعہ کرنے کا سبب بنا تو اس سے دورِ جدید میں علمی توسیع کو کافی مدد ملی۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں امام جعفر صادقؑ کے عہد میں صنعت کو دورِ حاضر کی طرح ترقی اور فروغ حاصل نہیں تھا لہٰذا آپ نے نور کا نظریہ تو بیان کردیا لیکن خود دوربین بنا کر اس سے اجرامِ فلکی کا مشاہدہ نہیں کرسکے۔ البتہ دوربین نہ بنا سکنے سے آپ کے نظریہ نور کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

آیا نیوٹن جس نے قوتِ جاذبہ کے قانون کا انکشاف کیا اس سیب کو جو اس کے سر پر گرا اور اس قانون کے انکشاف کا سبب بنا فضاء میں بھیجنے اور زمین کے گرد گردش دینے پر قادر ہوا؟

سبھی جانتے ہیں کہ جو راکٹ آج زمین کے گرد گردش کررہے ہیں یا چاند' مریخ اور زہرہ کی طرف جارہے ہیں۔ سب اسی قوتِ جاذبہ کے عمومی قانون کے پابند ہیں جسے نیوٹن نے منکشف کیا تھا' لیکن خود نیوٹن کیا آج کے انسانوں کی طرح اس سے عملی استفادہ کرسکا؟ پھر بھی نیوٹن کی یہ ناکامی کیا اس کے انکشاف کی وقعت و اہمیت میں ذرہ

برابر بھی کمی پیدا کرتی ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ نیوٹن چونکہ ایک راکٹ آسمان کی طرف نہیں بھیج سکا اور اسے زمین کے چاروں طرف گردش نہیں دے سکا لہٰذا اس کا انکشاف بے وقعت ہے؟ اگر کوئی شخص ایسی بات کہے تو صاحبانِ عقل کے نزدیک وہ خود حقیر ہوجائے گا کیونکہ یہ قول اس کی کم عقلی کی دلیل سمجھا جائے گا اگر نوعِ بشر آج بھی نیوٹن کے بتائے ہوئے اس قانون سے عملی فائدہ نہ اٹھا سکتی تب بھی اس کے اس عظیم علمی انکشاف کی عظمت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی کیونکہ دنیا جانتی تھی اور جانتی ہے کہ نظامِ شمسی سے باہر بھی جو سورج اور کہکشاں ہیں وہ بھی اسی قانون کی پیروی کررہے ہیں اور اس ترتیب سے فضائی سفروں میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ فضائی راکٹ اس نظامِ شمسی سے باہر بھی روانہ کئے جاسکیں گے۔ اور عملی تجربے سے معلوم ہوگا کہ اس عالم سے ماوراء بھی قوتِ جاذبہ کا قانون کائناتی حرکات کا ناظم ہے یا نہیں؟

گو کہ آج تک جو تجربات عمل میں آئے ہیں ان کے پیشِ نظر سمجھ میں آتا ہے کہ کائنات کے اندر کوئی استثناء موجود نہیں ہے اور جو قانون ایک حصے میں کارفرما ہے وہی دوسرے حصوں میں بھی کام کررہا ہے لیکن جب تک تجربے کی کسوٹی پر جانچ کے نہ دیکھ لیا جائے، قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہی قانون ہر جگہ نافذ ہے۔

امام جعفر صادقؑ کے نظریہ نور میں دوسرا قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ نور اشیاء کی طرف سے انسان کی آنکھ کی جانب آتا ہے۔ درحالیکہ اس سے قبل یہ کہا جاتا تھا کہ روشنی آنکھ سے اشیاء کی طرف جاتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس نظریئے کو رد کیا اور فرمایا کہ روشنی آنکھ سے اشیاء کی طرف نہیں بلکہ اشیاء سے آنکھ کی طرف آتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم تاریکی میں کوئی چیز نہیں دیکھ سکتے، درحالیکہ اگر نور آنکھ سے اشیاء کی طرف جاتا تو اندھیرے میں بھی ہر چیز نظر آتی۔

آپ نے فرمایا کہ کسی چیز کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ چیز روشن ہو اگر وہ خود روشن نہیں ہے تو ضرورت ہے کہ اس پر کسی دوسری نورانی چیز کا نور پڑے اور اسے

روشن کرے تاکہ دیکھی جاسکے۔

روشنی کی سرعتِ رفتار کے بارے میں بھی آپؑ نے ایک نظریہ پیش فرمایا جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت جاذبِ توجہ ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ جو نور ہماری آنکھ کی طرف آتا ہے اس کی سرعت فوری ہے اور یہ حرکات کی قسموں میں سے ایک ہے۔ ہم ایک بار پھر اس نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ اس زمانے کے ٹیکنیکی وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ آپ سرعتِ نور کا کوئی پیمانہ قائم کرتے۔ لیکن یہ بیان فرما دیا کہ نور حرکت ہے اور اس کی سرعت فوری ہے اور تقریباً یہی نظریہ اِس زمانے میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

آپؑ سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز اپنے درس میں آپ نے فرمایا کہ "طاقتور نور وزنی اجسام کو حرکت میں لاسکتا ہے اور جو نور طورِ سینا پر حضرت موسیٰؑ کے سامنے ظاہر ہوا تھا وہ ایسے ہی انوار میں سے تھا کہ اگر خدا کی مشیئت ہو تو پہاڑ کو متحرک کردے۔ اس روایت کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالباً آپؑ نے اس طرح لیزر شعاعوں کی بنیادی تھیوری کی پیش گوئی فرمائی ہے۔

ہمارے خیال میں امام جعفر صادقؑ نے نور کی حرکت و سرعت اور اس کے بارے میں کہ روشنی اشیاء سے آنکھ کی طرف آتی ہے جو کچھ فرمایا ہے اس کی اہمیت بظاہر لیزر کی تھیوری سے زیادہ ہے کیونکہ یہ امام جعفر صادقؑ سے پہلے بھی بیان کی جاچکی ہے، لیکن نور کی حرکت و سرعت، اس کے ارتکاز اور اس کے اشیاء کی جانب سے آنکھ کی طرف آنے کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ آپؑ ہی کی ذات سے مخصوص ہے۔

قدیم زمانوں سے مختلف قوموں میں یہ عقیدہ موجود تھا کہ نور اجسام کو حرکت میں لاسکتا ہے۔

قدیم مصر میں یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ نور ہر چیز سے گزر سکتا ہے اور اجسام کو متحرک کرسکتا ہے یہاں تک کہ پہاڑ بھی اس کو گزرنے سے نہیں روک سکتے اِن کے اعتقاد میں معمولی روشنیاں پہاڑ سے گزرنے اور اسے متحرک کرنے کی طاقت نہیں رکھتیں، لیکن

اگر طاقتور روشنی وجود میں آجائے تو ایسا کر سکتی ہے اور یہ اس کی رفتار پر منحصر ہے کہ پہاڑ کے درمیان سے گزر کر اسے جنبش میں لے آئے۔

اس نظریئے کے طبیعیاتی سبب کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے لیکن تمام قدیم اقوام کے درمیان یہ عقیدہ موجود تھا۔ اسی طرح ان مذاہب کے وجود میں آنے سے قبل جن کی تاریخ ہمارے پاس ہے۔ یہ عقیدہ رائج تھا کیونکہ ان ادیان اور مذاہب سے قبل لوگ جادوگری پر عقیدہ رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک دین اور جادوگری کے درمیان کوئی فرق نہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ نور حجابات سے گزرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اجسام کو حرکت میں لاسکتا ہے اور یہ بھی ایک قسم کی جادوگری ہے۔

اس عقیدے کی بنیاد اور آغاز سے ہم واقف نہیں ہیں اور جن لوگوں نے اس سلسلے میں کچھ کہا ہے وہ محض قیاس ہے ورنہ کوئی ایسا ماخذ موجود نہیں ہے جس سے پتہ چلے کہ یہ ابتداء میں کس قوم میں پیدا ہوا۔

اگر ہم نور کے انرجی ہونے کے عقیدے سے ہٹ کر دیکھیں تو امام جعفر صادقؑ کے نظریئے میں سرعتِ نور کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ وہی چیز ہے جسے لوگ آج جانتے ہیں اور روشنی کی تیز رفتاری کا حساب ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر لگایا گیا ہے۔ یہ سرعت آج سرعت شمار نہیں ہوتی کیونکہ جدید علمی پیمانوں کے لحاظ سے ایک سیکنڈ بھی طولانی مدت ہے اور نجومی مسافتوں کے لحاظ سے تین لاکھ کلومیٹر ایک مختصر فاصلہ ہے۔

البتہ قدیم پیمانوں کو سامنے رکھنے کے بعد ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کی رفتار سرعت شمار ہوتی تھی۔ روشنی کی سرعتِ رفتار کا پتا لگانے میں بھی امام جعفر صادقؑ کو اوّلیت حاصل ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کی ثقافت اور علمی تحقیق کی عمارت چار ستونوں پر قائم تھی۔

اس ثقافت کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ بلاوجہ اور سخت قسم کے

تعصّب سے پاک ہے اور اس میں مذہبی ادارے کا ایک بنیادی عامل یہ بھی ہے کہ آپ نے اس قسم کے تعصّب سے علیحدگی اختیار کی اور شیعہ مذہب کے پیروکاروں کے ہاتھوں میں کوئی ایسا بہانہ یا دستاویز نہیں دی جسے ایسے متعصّبانہ رویئے کی سند بنا کر وہ آپس میں تفرقہ پیدا کریں اور اس مذہب میں طرح طرح کے فرقے پیدا ہوں۔

امام جعفر صادقؑ جب پیغمبرِ اسلامؐ یا اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی کی تعریف کرتے تھے تو انہیں ایک عام انسان کی صورت میں پیش کرتے تھے نہ انہیں خدائی کی منزل تک پہنچاتے تھے اور نہ مافوق بشر مخلوقات میں شمار کرتے تھے تاکہ یہ خیال نہ پیدا ہو کہ ان کا وجود آدمی اور خدا کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے۔ اگر آپ ایسا کہتے تو شیعوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا اور یہ بحث اٹھ کھڑی ہوتی کہ خدا اور انسان کے درمیان حدِ فاصل کس قدر ہے؟ اگر یہ فاصلہ ایک سو اسی درجے پر فرض کیا جائے اور خدا ایک سو اسی درجے پر اور نوعِ بشر پہلے درجے پر ہو تو آیا پیغمبرِ اسلامؐ ہم سے نوے درجے کے فاصلے پر ہیں یا سو درجے پر یا ایک سو پچاس درجے پر اور اس طرح آپؑ خدا سے تیس درجے سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں لیکن نوعِ بشر سے ایک سو پچاس درجے دور ہیں؟

شاید یہ کہا جائے کہ جس وقت امام جعفر صادقؑ یہ کہتے کہ پیغمبرِ اسلامؐ اور آپؑ کے اجداد' خدا اور عام انسان کے درمیان فرق اور فاصلہ قائم کرتے ہیں تو یہ بحث پیدا نہ ہوتی کہ وہ خدا سے زیادہ قریب ہیں یا انسان سے لیکن بعض مذاہب کے اندر گزشتہ زمانے میں یہ بحث رونما ہو چکی ہے۔

باوجود یہ کہ امام جعفر صادقؑ نے پیغمبرِ اسلامؐ' اپنے آباؤ اجداد اور خود کو عام افراد کے بطور پیش کیا' یہ ہرگز نہیں کہا کہ یہ ہستیاں الوہیت کا پہلو رکھتی ہیں۔ کبھی یہ بات زبان پر نہیں لائے کہ یہ جسمانی خلقت کے لحاظ سے مافوقِ بشر ہیں اور ان کے باطن و روحانی فضائل و کمالات کے بارے میں قطعاً غلو نہیں کیا۔ پھر بھی آپ کے بعد تیسری صدی سے شیعوں میں کئی فرقے پیدا ہوئے اور یہ عرفانی فرقے تھے لیکن اس طرح تعصّب کا مظاہرہ کرتے تھے جیسے ان میں سے ہر ایک فرقہ ایک جداگانہ مذہب کا حامل

ہو۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ جعفری مذہب کی ثقافت کے چار ارکان میں سے ایک عرفان بھی تھا۔ لیکن کہا جاسکتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کا عرفان اعتدال کا پہلو رکھتا تھا اور آپؑ عرفان کو صرف مذہبِ شیعہ کی بخوبی شناخت کے لئے کار آمد سمجھتے ہیں۔ نہ یہ کہ اس حد سے تجاوز کر کے خود ایک مذہب کی صورت اختیار کرلے۔

البتہ شیعوں کے جو عرفانی فرقے تیسری صدی کے بعد وجود میں آئے انہوں نے غلو سے کام لیا اور ان میں سے بعض وحدتِ خالق و مخلوق کے قائل ہوگئے جب کہ امام جعفر صادقؑ اس سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔

بعض نے اس طرح بھی غلو کیا کہ وحدتِ خالق و مخلوق میں انسان کو خالق سے برتر تصور کیا جو اصولِ مذہبِ شیعہ کے لحاظ سے کفر ہے۔

لیکن ان تمام عرفانی فرقوں نے آپؑ کے مذہبی ادارے کی آزادی سے فائدہ اٹھایا' جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس میں کسی شخص کو اس جرم میں لائقِ ملامت و سزا قرار نہیں دیا جاتا تھا کہ اس نے کوئی نظریہ پیش کیا ہے۔ البتہ اپنے زمانۂ حیات میں خود امام جعفر صادقؑ اور آپ کے بعد آپ کے شاگرد مخالفوں کے اقوال کو رد کرتے رہتے تھے جس طرح ابن راوندی کے قول کو رد کیا ہے۔

ان تمام عرفانی فرقوں میں جو امام جعفر صادقؑ کے بعد پیدا ہوئے خالق و مخلوق کی وحدت نظر آتی ہے ان کے درمیان فرق صرف اتنا ہے کہ وحدتِ خالق و مخلوق بعض فرقوں میں بلاواسطہ ہے اور بعض میں بالواسطہ ان میں سے بعض کے نزدیک ہر آدمی خدا کے ساتھ متحد ہے اور بالقوت خالق و مخلوق کی قدرت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لیکن دوسرے فرقوں میں معمولی افراد کو خدا کے ساتھ وحدت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ پیغمبرِ اسلامؐ اور ائمۂ معصومینؑ خدا کے ساتھ ایک وجودِ واحد کی تشکیل کرتے ہیں۔

ایسے فرقے بھی وجود میں آئے جن میں فرقے کا رہبر جسے پیر یا قطب یا مرشد یا غوث کہتے ہیں' خدا کے ساتھ وحدتِ وجود رکھتا ہے۔

(مضمون نگار کے خیال میں جنہوں نے ہر فرقے کو شیعہ سمجھ لیا ہے) ان فرقوں

کے پیرو جو شیعہ تھے اپنے قطب کے لئے اتنے احترام کے قائل تھے کہ انہیں ائمہؑ یہاں تک کہ پیغمبرؐ سے بھی بلند سمجھتے تھے لیکن ان کی زبان سے نہیں سنا جاتا تھا کہ قطب ائمہؑ اور پیغمبرؐ سے افضل ہے۔ غالباً اپنے پیر یا قطب کے لئے ایسا کہنے میں انہیں شرم محسوس ہوتی تھی یا اس چیز سے ڈرتے تھے کہ یہ بات کہنے سے کافر ہو جائیں گے۔

ان فرقوں کا عرفانی عقیدہ قدیم مصریوں کے اس عقیدے سے مشابہ تھا جو وہ اوزیریس اور راوزیس کے لئے رکھتے تھے۔ وہ متعدّد خداؤں کے معتقد تھے لیکن آمون را کو سب سے بزرگ مانتے تھے اور اختصار کے لئے اسے آمون کہتے تھے' قدیم مصریوں کے اعتقاد میں آمون خداؤں کا خدا تھا۔ لیکن اوزیریس موت کا خدا تھا' باوجودیکہ یہ بھی آمون کا ماتحت شمار کیا جاتا تھا لیکن خداؤں کے خدا سے زیادہ بااقتدار تھا۔ اور اس کے کاموں سے بڑے کام کرتا تھا۔ اسے اتنی قدرت حاصل تھی کہ آمون کو بھی موت کی دھمکی دیتا تھا اور وہ اس کی دھمکی کے سامنے سرِ خم کر دیتا تھا۔ حالانکہ خداؤں کے خدا کو اتنا طاقتور ہونا چاہئے کہ سبھی اس کے سامنے سر جھکائیں۔

امام جعفر صادقؑ نے یہ نہیں چاہا کہ شیعہ مذہب میں مختلف فرقے پیدا ہوں اور اگرچہ آپ کے بعد متعدد عرفانی فرقے وجود میں آئے لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی مذہبِ شیعہ کے اصول سے مخالفت نہیں کی اور ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ ان میں کوئی یہ دعویٰ کرتا کہ وہ شیعہ نہیں ہے یا اس مذہب کے ائمہؑ کو نہیں مانتا۔

یہاں تک کہ جب اسماعیلیہ فرقہ پیدا ہوا جو عرفانی نہیں بلکہ مذہبی فرقہ تھا' تو اس نے امام جعفر صادقؑ تک ائمۂ شیعہ کو برحق سمجھا اور اس فرقے کی مذہبی بنیاد ابتداء میں وہی تھی جو جعفری مذہب کی تھی لیکن جب اس میں وسعت پیدا ہوئی تو چند مکاتبِ فکر میں تقسیم ہو گیا۔

بعد کے زمانوں میں جاہ و مال کی محبت کی وجہ سے جس نے اسماعیلیوں میں تفرقہ ڈالا ان کے بعض داعی ایسی باتیں کہنے اور لکھنے لگے جو بدعت کا پہلو رکھتی تھیں، ورنہ اسماعیلیوں کی پہلی قوت امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت ہی تھی۔

خلفائے فاطمی نے جن کی مدتِ خلافت (۲۶۷) دو سو سڑسٹھ سال تھی، امام جعفر صادقؑ کے مذہبی ادارے سے توانائی حاصل کی۔ پہلا فاطمی خلیفہ عبیداللہ تھا جو شام میں وہاں کے شیعوں کا پیشوا شمار کیا جاتا تھا۔ اس نے تیسری صدی ہجری کے نیمۂ آخر میں عباسی خلفاء کے مقابل اپنی خلافت کا اعلان کیا اور لیبیا کو افریقہ میں شامل کرکے اسے مرکزِ خلافت بنانے میں کامیاب ہوا۔

بعض لوگوں نے خیال کیا ہے کہ فاطمیوں کی خلافت ایک مقامی حکومت تھی درحالیکہ ان شیعہ فاطمیوں نے ایک بڑی سلطنت قائم کرلی تھی اور عبیداللہ کے جانشینوں نے بتدریج جنوبی اٹلی کے جزیرہ سسلی، مغربی عربستان کے ایک حصے فلسطین، شام اور مصر پر تصرف حاصل کرکے شہر قاہرہ کو اپنا دارالخلافہ بنالیا تھا۔ البتہ فاطمیوں نے ایک بدعت ایجاد کی اور ان کا چھٹا خلیفہ الحکیم چوتھی صدی ہجری کے نیمۂ آخر میں سختی سے عرفان میں مشغول ہوگیا لیکن امام جعفر صادق کے عرفان کے طرز پر نہیں، جس کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ مبالغے سے دور تھا، بلکہ اس عرفان پر جو وحدتِ وجود کا عقیدہ رکھتا تھا۔

وحدتِ وجود کے عرفانی عقیدے کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مکتب کے پیرو عرفاء کا قول تھا کہ اگر ہم یہ کہیں کہ خدا نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی نے خدا کو پیدا کیا ہو، پھر وہ بھی کسی دوسرے کا مخلوق قرار پائے گا اور یہ تسلسل کبھی ختم نہ ہوگا کیونکہ جو پیدا کرنے والا کسی چیز کو خلق کرتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود دوسرے کا پیدا کیا ہوا ہو۔ لہٰذا خدا شناسی کی منزل میں یہ عظیم مشکل صرف ایک ہی ذریعے سے دور ہوسکتی ہے اور وہ ہے وحدتِ خالق و مخلوق کا عقیدہ۔ اس لئے کہ جب ہم یہ طے کرلیں گے کہ خدا اور اس کی دیگر مخلوقات جن میں انسان بھی ہے، ایک ہی ہیں تو پھر یہ سوال پیش نہیں آئے گا کہ خدا کو کس نے پیدا کیا۔

چھٹے فاطمی خلیفہ نے عرفانی خیالات میں غلو کی وجہ سے ایک بار یہ سوچنا شروع کیا کہ اپنے کو خدا کہے اور لوگوں کو بتائے کہ وہ خدا ہے۔ اس سلسلے میں ایک کہانی بھی

مشہور ہے جسے بعض لوگوں نے فراعنہ مصر کی طرف منسوب کیا ہے درحالیکہ یہ الحکیم سے متعلق ہے اور اس کی اجمالی روداد یہ ہے کہ جب الحکیم نے خدائی کا دعویٰ کرنا چاہا تو اس کے وزیر نے اسے روکا اور کہا کہ لوگ آپ کی خدائی تسلیم نہیں کریں گے۔ لیکن اس نے کہا کہ وہ خود کو خدا سمجھتا ہے۔ اور لوگوں کو بھی اسے خدا ماننا چاہئے۔

وزیر نے کہا' تو پھر آپ حکم دیجئے کہ آپ کی مملکت میں تمام کاشتکار گیہوں کے بجائے باقلا بوئیں تاکہ سب کی اصلی غذا یہی باقلا بن جائے۔ چنانچہ الحکیم نے قطعی حکم نافذ کردیا کہ اب گندم نہیں بلکہ باقلا بویا جائے ۔

سات سال گزرنے کے بعد ایک روز وزیر کسی راستے سے گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک دراز قد اور کوتاہ قد آدمی آپس میں سخت جھگڑا کررہے ہیں۔ وزیر قریب گیا اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کرکے وجہ نزاع دریافت کی۔ کوتاہ قد نے کہا کہ بات یہ ہے کہ اس نے میرے لڑکے کو قتل کیا ہے۔

وزیر نے پوچھا کہ کیا تم نے اس کے لڑکے کو قتل کیا ہے؟ اس شخص نے ایک نعل اپنی جیب سے نکالی اور کہا کہ میں نے اسے ایک گلی میں پایا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ ایک گھوڑا خریدوں اور یہ نعل اس کے سم میں لگوادوں۔ اس کے بعد اس کی لگام اس دروازے کی کنڈی میں باندھ دوں۔

کوتاہ قد نے کہا یہ دروازہ میرا ہے' اس جگہ میرا گھر بنے گا' پھر میرا ارادہ ہے کہ میں شادی کروں گا' اس کے بعد میرے یہاں لڑکا پیدا ہوگا اور جب وہ لڑکا گلی میں کھیلنے کے لئے گھر سے باہر نکلے گا تو دروازے میں اس شخص کا گھوڑا بندھا ہوگا جو لات مار کر میرے لڑکے کو مار ڈالے گا۔ یہ کہہ کر اس نے پھر درازقد پر حملہ کردیا۔

وزیر ان دونوں کو انہی کے حال پر چھوڑ کر الحکیم کے پاس پہنچا اور کہا کہ اب آپ خدائی کا دعویٰ کرسکتے ہیں کیونکہ سات سال تک صرف باقلا کھانے کی وجہ سے لوگوں کی عقل زائل ہوچکی ہے۔ ان چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ روایت محض ایک افسانہ ہے۔ ان میں سے ایک' عقل پر باقلا کی منفی تاثیر بھی ہے۔ جو صحیح نہیں ہے کیونکہ باقلا

کا زیادہ استعمال مزاجی اعتبار سے تو مضر ہو سکتا ہے لیکن عقل کو زائل نہیں کرتا۔

الحکیم خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور اگر کوئی شخص اس سے دلیل مانگتا تھا تو کہتا تھا کہ خدا اور کائنات اور خالق و مخلوق سب ایک ہیں اور چونکہ خالق کے ساتھ وحدت رکھتا ہوں لہٰذا خدا ہوں اور تمہیں میری پرستش کرنا چاہئے۔

کہا جاتا ہے کہ صلاح الدین ایوبی نے فاطمی خلیفہ کو اس کے خدائی کے دعویٰ کی وجہ سے قتل کرنے کے لئے مصر پر فوج کشی کی اور قاہرہ پر قابض ہوگیا' لیکن جس زمانے میں الحکیم نے خدائی کا دعویٰ کیا اور جس وقت صلاح الدین مصر میں وارد ہوا دونوں کے درمیان ایک سو اکیاون سال کا فاصلہ ہے۔ لہٰذا اس طرح صلاح الدین ایوبی گویا الحکیم کے دعویٰ ربوبیت کے ایک سو اکیاون سال بعد مصر پہنچا۔ البتہ تحقیق یہی ظاہر کرتی ہے کہ فاطمی خلافت کا اقتدار صلاح الدین ایوبی ہی کے ہاتھوں ختم ہوا۔

الحکیم خدا کا دعویٰ کرنے میں کئی مرحلوں سے گزرا۔ وہ پہلے مرحلے پر وہی بات کہتا تھا جو اس کے ہم مسلک عرفاء کا قول تھا۔ وہ ظاہر کرتا تھا کہ خالق و مخلوق ایک ہیں اور اس منزل سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا نے اس کے اندر حلول کیا ہے اور یہ بقول اس کے کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ خدا تمام موجودات میں ہے لہٰذا اس کے اندر بھی موجود ہے۔

الحکیم نے بھی آج کل کے شہرت طلب لوگوں کی طرح جو خود کو مشہور کرنے کے لئے پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو مامور کیا تھا کہ مصر' شام' فلسطین اور ان دیگر ممالک میں جو فاطمی سلطنت کے زیر نگین ہیں اس چیز کی تبلیغ کریں کہ خدا نے خلیفہ کے اندر حلول کیا ہے۔

یہ تبلیغ اس زمانے میں کی گئی جب چوتھی صدی ہجری کا نیمۂ آخر تھا اور اس وقت مسالکِ تصوّف و عرفان کے مشائخ و اقطاب سے عقیدت اسلامی ممالک میں ہر دور سے زیادہ تھی۔ چوتھی صدی ہجری ان ممالک میں علمی ترقی کی صدی تھی۔ لیکن علمی پیشقدمی کے مقابل تصوّف و عرفان کے اقطاب و مشائخ سے عقیدت مندی میں بھی

وسعت پیدا ہوگئی تھی اور باخبر لوگوں کا ایک گروہ بھی تصوّف اور عرفان کے فرقوں سے وابستہ ہو رہا تھا۔

اس دور کا تقاضہ یہ تھا کہ ہر شخص کسی عرفان یا تصوّف کے فرقے سے منسلک رہے تاکہ اپنے زمانے والوں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ لوگوں کا تصور تھا کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی فرقے کا رکن نہیں ہے تو وہ رفتارِ زمانہ کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔

اس دور کے تقاضوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جو شخص کسی عرفانی یا تصوّف کے فرقے کی رہبری کا مدعی ہو اسے صاحبِ کرامت ہونا چاہئے اور اپنے پیروؤں کے سامنے خارقِ عادت کام کرنا چاہئیں۔ یہ کرامات، تاریخ کی صورت میں نقل ہوتی تھیں اور ہمیشہ گزشتہ زمانے میں ان کا اتفاق ہوا ہوتا تھا، کوئی شخص یہ نہیں کہتا تھا کہ میں نے ایک پیر یا قطب سے یہ کرامت دیکھی ہے بلکہ یہ کہتا تھا کہ گزشتہ زمانے میں ایسا ہوا ہے۔

البتہ چونکہ اکثر اقطاب و مشائخ پرہیز گار قسم کے لوگ ہوتے تھے لہٰذا جب ان کے مرید اور پیرو یہ سنتے تھے کہ ان سے خارقِ عادت باتیں ظاہر ہوئی ہیں تو خود سے دیکھے بغیر بھی تسلیم کر لیتے تھے۔

ایسے ہی ایک دور میں جب مختلف فرقوں کے مرشدوں سے خوارق اور کرامات کا ظہور ایک عام چیز تھی اس وقت لوگوں نے سنا کہ خدا نے ان کے خلیفہ میں حلول کیا ہے، تو زیادہ حیرت زدہ نہیں ہوئے۔ اس کے بعد خلیفہ ربوبیت کے آخری مرحلے میں داخل ہوگیا اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ وہ خدا ہے اور لوگوں کو اس کی پرستش کرنا چاہئے۔

پہلے اور دوسرے مرحلے میں الحکیم جو کچھ کہہ رہا تھا وہ تو وحدتِ وجود کی بنیاد پر عارفانِ زمانہ کے نظریات کے مطابق تھا، لیکن جب اس نے دعویٰ کیا کہ وہ خدا ہے اور لوگوں کو اس کی پرستش کرنا چاہئے تو یہاں سے حیرت و تعجب کا آغاز ہوا اور نکتہ چینوں کی زبانیں کھل گئیں۔

ہم جانتے ہیں کہ الحکیم اور دوسرے فاطمی خلفاء شیعہ تھے اور شیعوں کا یہ عقیدہ

ہے کہ خدا آٹھ صفاتِ ثبوتیہ رکھتا ہے اور اس کی آٹھ صفتیں ایسی ہیں جنہیں صفاتِ سلبیہ کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے خلیفہ پر اعتراض کیا انہوں نے کہا کہ خدا کی صفاتِ ثبوتیہ میں سے ایک یہ ہے کہ وہ حیّ ہے' یعنی اسے موت نہیں آئے گی۔ درحالیکہ کوئی خلیفہ زندہ نہیں ہے اور جب اس کی عمر پوری ہوگئی تو دنیا سے رخصت ہوگیا۔

خلیفہ نے اس گرفت پر شکست نہیں مانی اور کہا کہ خدا کے حیّ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ رہے لیکن اس کی موجودگی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس میں تغیر نہیں ہوتا۔ خدا تغیر اختیار کرتا ہے اور اس کی تبدیلی کو ہم موت کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ لیکن ہماری موت حقیقی موت نہیں ہے بلکہ یہ ایک ظاہری انقلاب ہے۔ میں حیّ اور زندہ ہوں اور کبھی نہیں مروں گا۔ جو چیز تمھاری نگاہوں میں موت بن کر ظاہر ہوگی وہ صرف میرے لباس کی تبدیلی ہوگی۔

مخالفین نے کہا کہ خدا قادر ہے اور جو چاہے کرسکتا ہے۔ لہٰذا خلیفہ بھی اس کا ثبوت دے کہ ہر کام کی قدرت رکھتا ہے۔

الحکیم نے جواب دیا کہ خدا چونکہ عالم ہے اور ہر شئے کو پہلے ہی سے جانتا ہے لہٰذا جو اسے کرنا تھا کرچکا ہے اور اب کوئی ایسا کام باقی نہیں ہے جسے انجام دے۔ چنانچہ آج یا آئندہ اب خدا سے کوئی نیا کام ظہور پذیر نہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ خدا کوئی امرِ محال انجام نہیں دیتا اور کسی کو اس سے ایسی توقع نہیں رکھنا چاہئے۔

اس سے کہا گیا کہ صفاتِ ثبوتیہ میں سے اس کا عالم ہونا بھی ہے اور اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ لہٰذا اگر خلیفہ خدا ہے اور ہر شئے کا علم رکھتا ہے تو جو مسائل اس سے پوچھے جائیں ان کے جواب دے۔ اس کے علاوہ اسے دیگر اقوام کی زبانوں میں کلام بھی کرنا چاہئے۔ خلیفہ نے کہا کہ خدا کے عالم ہونے سے مراد وہ علم نہیں ہے جس پر ہر شخص کی دسترس ہو۔ اسکے علاوہ شرعی اور رسمی مسائل کے جوابات دینا اور دوسری قوموں کی زبانوں میں گفتگو کرنا بشری علوم سے تعلق رکھتا ہے اور یہ خدا کے شایانِ شان نہیں ہے۔ خدا کا علم وہ علم ہے جس سے نہ کوئی بشر آگاہ ہے اور نہ کبھی آگاہ ہوگا۔ میرا

مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ تمہارے شرعی اور رسمی مسائل کے جوابات دوں اور غیر زبان میں گفتگو کروں۔ لوگوں نے کہا کہ اب جب کہ خلیفہ خدا ہے اور علومِ الٰہی سے آگاہ ہے تو ان میں کچھ ہمارے سامنے بھی بیان کرکے ہمیں بہرہ مند کرے۔

خلیفہ نے کہا کہ آدمیوں کے کان علومِ الٰہی کے اسرار سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور انسانی عقل' ان کا ادراک نہیں کرسکتی۔ اگر میں ان علوم کا ذرّہ بھر بھی تمہارے سامنے بیان کردوں تو تم سب کے سب فوراً مرجاؤ گے' لہٰذا اس کی امید نہ رکھو کہ اپنی زندگی میں ان سے فائدہ اٹھا سکو گے۔

فرقۂ معتزلہ کے مشائخ میں سے ایک شخص ابوطالب محمد بن خوید نے کہا کہ اگر محبوب کا وصال میسر ہو جائے تو میں جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اگر خلیفہ علومِ الٰہی کا ایک شمہ بھی مجھے بتا دے اور اس کی تعلیم دے دے تو میں پورے ذوق و شوق سے جان دینے کے لئے تیار ہوں اس لئے کہا جاتا ہے کہ جو شخص حقیقت کو معلوم کرلے وہ مرجائے گا۔ کیونکہ حقیقت اس قدر عظیم' پراثر اور درخشاں ہے کہ آدمی اس کے ادراک کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔

خلیفہ نے کہا! اے محمد بن خوید میں تمہاری درخواست منظور کروں گا اور اپنے علم کا ایک شمہ تمہیں سکھا دوں گا لیکن یہ سمجھ لو کہ تم مرجاؤ گے۔ محمد بن خوید روزانہ انتظار کرتا رہا کہ خلیفہ اسے بلا کر اپنے علوم الٰہی میں سے کچھ سکھائے لیکن الحکیم نے اسے طلب نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ایک رات محمد بن خوید مرگِ مفاجات سے انتقال کرگیا۔ صبح کو جب اس کی موت کی خبر خلیفہ تک پہنچی تو اس نے کہا کہ میں نے تو پہلے ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ آدمی کا جسم و روح خدائی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اور اگر میں اپنا یہ علم ذرا سا بھی سکھادوں تو وہ مرجائے گا' لیکن اس نے اس پر اصرار کیا اور اسی اصرار کی وجہ سے جان دے بیٹھا۔ اس زمانے کے سادہ لوح اشخاص نے خلیفہ کی بات پر یقین کرلیا بلکہ جو لوگ یہ جانتے تھے کہ خلیفہ خدا نہیں ہے اور الٰہی علوم کا حامل نہیں ہوسکتا انہوں نے بھی زمانے کا رنگ دیکھتے ہوئے یہی ظاہر کیا کہ اس کے قول پر اعتبار

کررہے ہیں اور محمد بن خوید نے چونکہ تھوڑا سا خدائی علم معلوم کرنا چاہا تھا' لٰہذا مرگیا۔

باوجودیکہ الحکیم خدائی کا مدعی تھا لیکن جو شیعہ اس کی سلطنت میں آباد تھے ان میں امام جعفر صادقؑ کے مذہب و مکتب کی روح کارفرما تھی اور ہم بتا چکے ہیں کہ اس کی ایک خصوصیت اپنا نظریہ پیش کرنے کی آزادی بھی تھی چنانچہ اگر کوئی شخص مذہبی مسائل کے بارے میں اپنے کسی نظریئے کا اظہار کرتا تو اسے پریشان نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ فطری بات ہے کہ جب کوئی شخص خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ نہیں چاہتا کہ اس کے دعوے پر نقد و تبصرہ کیا جائے اور ثبوت کے لئے اس سے دلیل کا مطالبہ کیا جائے لیکن چونکہ شیعہ' جعفری مکتب کی آزادی سے بہرہ مند تھے لٰہذا الحکیم بھی لوگوں کے اعتراض پر پابندی نہیں لگا سکتا تھا اور مذہبی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے یہ باتیں سننا پڑتی تھیں۔

محمد بن خوید کے مرنے کے بعد تنقید و اعتراض کا سلسلہ ختم نہیں ہوا اور لوگوں نے الحکیم سے خواہش کی کہ مردے کو زندہ کردے۔ اس سے کہا گیا کہ قدرتِ خداوندی کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ وہ مردے کو زندہ کرسکتا ہے اور خدا کے علاوہ کسی اور کو یہ اقتدار حاصل نہیں ہے۔ لٰہذا ہمیں اپنی خدائی کا یقین دلانے کے لئے آپ کو اس کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔

جو لوگ خلیفہ کی قدرت کا مشاہدہ کرنے کے خواہشمند تھے انہوں نے درخواست کی کہ گھسیارے کے باپ کا تین سال پہلے انتقال ہوچکا ہے جو مرنے سے قبل لوگوں سے اپنا حساب نہیں چکا سکا تھا لٰہذا اب جو لوگ اس کے قرض خواہ ہیں ان کے اور اس کے بیٹے کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا ہے اگر خلیفہ مردے کو زندہ کردے تو ایک طرف تو اس کی قدرتِ خداوندی کا مظاہرہ ہوجائے گا اور دوسری طرف متوفی کے وارث اور قرض خواہوں کے درمیان کشمکش ختم ہوجائے گی' وہ زندہ ہوکر بتا دے گا کہ کس کا قرض خواہ ہے اور کس کا قرض دار۔

خلیفہ نے تحقیق کی کہ گھسیارے کے مرنے کے بعد اس کا کتنا ترکہ بچا ہے تو معلوم

ہوا کہ گھاس کی دکان اور سرمایہ تجارت کے علاوہ شہر کے اندر ایک مکان اور شہر سے باہر ایک باغ ہے۔ اس نے کہا کہ میں مردے کو تو زندہ کرسکتا ہوں لیکن اس کا بیٹا اس پر راضی نہ ہوگا اس لئے کہ اگر اس کا باپ زندہ ہوگیا تو جس میراث کو یہ تین سال سے اپنی جائیداد سمجھ رہا ہے اور اس پر مالکانہ تصرف کررہا ہے اسے واپس کرنا پڑے گا جب متوفی کے بیٹے نے یہ سنا کہ خلیفہ سے اس کے باپ کو پھر سے زندہ کرنے کی درخواست کی گئی ہے تو اتنا گھبرایا کہ فوراً قرض خواہوں سے سمجھوتہ کرلیا تاکہ ایسا نہ ہو کہ خلیفہ اس کے باپ کو زندہ کردے اور جس میراث پر وہ تین سال سے قابض ہے ہاتھ سے نکل جائے۔

لیکن جو لوگ خلیفہ کی قدرت نمائی کے خواہاں تھے۔ وہ خاموش نہیں ہوئے اور چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا مردہ زندہ کردیا جائے۔ جب الحکیم نے اپنے کو شکنجے میں دیکھا تو مسلمانوں کی کتابِ خدا یعنی قرآن مجید کی آیت کی غلط تفسیر کا سہارا لیا۔ اس آسمانی کتاب میں کہا گیا ہے کہ خدا زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے خارج کرتا ہے چنانچہ خدا اپنے اس قول اور مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ہمیشہ زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے خارج کرسکتا ہے۔ لیکن الحکیم نے کہا کہ میں اس خدائی قول کے مطابق کہ خدا کبھی تو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے تمہیں مطمئن کرنے کے لئے مردہ کو زندہ سے نکالتا ہوں۔ معترضین نے کہا کہ یہ کام تو قصاب بھی روزانہ کرتے رہتے ہیں اور مردہ گوسفندوں کو زندہ سے الگ کرتے ہیں۔ اگر خلیفہ واقعی خدا ہے تو اسے کسی انسان یا کم از کم کسی حیوان کو مرنے کے بعد زندہ کرنا چاہیئے۔ خلیفہ نے کہا یہ کام اپنے وقت پر انجام پائے گا اور اس وقت کا تعین بھی خدا ہی کرسکتا ہے۔

البتہ چونکہ اعتراض کرنے والے کسی طرح باز نہیں آتے تھے اور برابر کہتے رہتے تھے کہ خلیفہ کم از کم ایک ہی کام ایسا کرکے دکھائے جس سے اس کی خدائی ثابت ہو' لہٰذا الحکیم نے اپنے کو اس مستقل پریشانی سے بچانے کے لئے پہلی بار شیعی ثقافت میں یہ بدعت ایجاد کی کہ مذہبی مسائل میں آزادانہ بحث کی ممانعت کردی۔ ہم پہلے ہی بتا

چکے ہیں کہ اس مکتب میں شیعی ثقافت کا بنیادی رکن اور اس کی تقویت کا سبب ہر طرح کی مذہبی بحث کی آزادی تھا' یہاں تک کہ امام جعفر صادقؒ آپ کے بعد آپ کے شاگرد اور ان کے بعد دوسری اور تیسری نسل کے شاگرد بھی اعتراض کرنے والوں کے جوابات دیا کرتے تھے اور تمام شیعہ علاقوں میں کوئی شخص ایک صاحبِ فکر و نظر کو اس بنیاد پر نہیں ستاتا تھا کہ اس نے کسی مذہبی مسئلے کے سلسلے میں کوئی نیا نظریہ پیش کیا ہے۔

الحکیم نے اس آزادی کو محدود کیا اور اپنی اس حد بندی کو شرعی حیثیت دینے کے لئے کہا کہ جو شخص خدا کا منکر ہے اور خدا کے کاموں پر کوئی اعتراض کرتا ہے وہ مرتد ہے اور اس کا قتل واجب ہے لہٰذا خدا کی صفاتِ ثبوتیہ اور صفاتِ سلبیہ کے بارے میں ہر طرح کی بحث ممنوع ہے۔

یہ وہ پہلا قدم تھا جو الحکیم نے امام جعفر صادقؒ کی مذہبی ثقافت میں آزادی کو محدود کرنے کے لئے اٹھایا چنانچہ اس کے بعد پھر کسی نے خدائی کا دعویٰ کرنے والے شخص کی صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ میں بحث کی جرات نہیں کی۔ الحکیم کا یہ قدغن صرف انہی مسائل کے لئے تھا جو خدا کی صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ سے متعلق تھے' لہٰذا جو شیعہ اس کی حکومت میں زندگی بسر کررہے تھے وہ مجاز نہیں تھے کہ توحید کے بارے میں کوئی بحث کریں یا ایسی گفتگو کے بارے میں جو اس کی اور اس کے دعوے کی تائید کرتی ہو۔

البتہ شیعہ مذہب سے متعلق دیگر مسائل میں بحث کرنے کے لئے لوگ آزاد تھے اور خلیفہ اس سلسلے میں انہیں کوئی تکلیف نہیں دیتا تھا۔ جن لوگوں نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ حسن صباح نے الحکیم سے اثر قبول کیا تھا' انہیں غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ جب الحکیم نے خدائی کا دعویٰ کیا اور جب حسن صباح تعلیم کے لئے مصر گیا' ان دونوں کے درمیان اسّی (۸۰) سال کا فاصلہ ہے الحکیم نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں دعویٰ کیا اور حسن صباح پانچویں صدی کے نیمہ آخر میں حصولِ علم کے لئے مصر گیا۔ اس نے الموت میں منتقل ہونے کے بعد خدائی کا دعویٰ نہیں کیا اور ابتدائی برسوں میں مستقل

طور پر اپنے پیروؤں کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا' دوسرے یہ کہ تعلیم کے لئے مصر جانے کے بعد اس نے ایران کی قدیم تاریخ سے آگاہی حاصل کی۔

ممکن ہے اس کو قدیم ایران کی تاریخ کا علم اسکندریہ کے پرانے کتب خانے سے حاصل ہوا ہو وہ مکتب بھی جیسا کہ محتاجِ تفصیل نہیں ہے قدیم یونان کے علوم اور ادب سے استفادہ کرتا تھا اور اسی وجہ سے الموت میں مقیم ہونے کے بعد حسن صباح نے جو قدم اٹھایا وہ فقط ایک مذہبی اقدام نہیں تھا بلکہ قومی پہلو بھی رکھتا تھاایسی صورت میں فاطمی خلیفہ الحکیم کے دعوئے خدائی اور بعد میں حسن صباح کے اقدام—— کے درمیان بہت فرق پایا جاتا ہے اور یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ حسن صباح نے الحکیم سے اثر قبول کیا تھا۔

لوند یونیورسٹی میں—— تاریخِ مذاہب کے استاد سوئڈن کے پروفیسر بریم نے کہا ہے کہ الموت کے اسماعیلی ایران کی قدیم تاریخ سے تعلق رکھتے تھے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی پیش قدمی میں قومی مسئلہ بھی موثر تھا۔

ایک مدت تو معترضین کی زبان بند رکھی گئی لیکن جب خلیفہ کی سخت گیری میں کمزوری آئی تو ان لوگوں نے پھر آواز بلند کرنا شروع کی اور کہا کہ ہم نے خدا کی صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا ہے لیکن یہ صفتیں خلیفہ پر منطبق نہیں ہوتیں اور ہمارا اعتراض اسی سلسلے میں ہے نہ کہ توحید کے بارے میں' کیونکہ اسلام میں اس پر کسی مسلمان کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

خلیفہ نے محسوس کیا کہ یہ اعتراض دیگر بڑے اعتراضات کا پیش خیمہ ہے لہٰذا اس نے یہ حکمِ امتناعی جاری کردیا کہ جو شخص خلیفہ پر صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ کے انطباق سے متعلق کوئی اعتراض کرے گا وہ مرتد اور واجب القتل ہے چنانچہ دوبارہ جو زبانیں حرکت میں آرہی تھیں خاموش ہوگئیں۔

یہاں تک کہ جب خلیفہ میں اضمحلال پیدا ہوا اور اعتراضات پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو جو لوگ اعتراض کرنا چاہتے تھے اور جان کے خوف سے زبان کھول نہیں

سکتے تھے انہوں نے کہا کہ خلیفہ اگر خدا ہے تو اسے صاحبِ اولاد نہیں ہونا چاہئے کیونکہ آسمانی کتاب میں اسکی صراحت ہوچکی ہے کہ نہ خدا کسی سے پیدا ہوا ہے نہ اس سے کوئی متولد ہوتا ہے لیکن خلیفہ کے کئی بیٹے تھے اور وہ ان سے انکار بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ محبتِ پدری اسے روک رہی تھی اور کیونکہ وہ خدائی کے دعوے سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا اور اپنے بیٹوں کا انکار بھی نہیں کرسکتا تھا لہٰذا اس نے کہا کہ اگر خدا فرزند رکھتا ہے تو اس میں کیا خرابی ہے؟ آیا مسیحؑ خدا کے بیٹے نہیں تھے؟ اور کیا حدیث میں نہیں آیا ہے کہ تمام بندے خدا کے فرزند ہیں؟

مسیح کے بارے میں الحکیم جو بات کہہ رہا تھا اس سے وہ مسیحیوں کے عقائد کا ایک حصہ شیعوں کے مسلک میں داخل کررہا تھا' کیونکہ وہ لوگ باوجودیکہ مسیحؑ کو پیغمبر اور خدا کا فرستادہ مانتے تھے لیکن یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں بلکہ شیعیت کے دائرے سے باہر بھی کوئی مسلمان اس چیز کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ خدا کا بیٹا بھی ہوسکتا ہے۔

خلیفہ نے محض اس مقصد سے کہ صاحبِ اولاد ہونا اس کے دعوئے خدائی میں مخل نہ ہو کہہ دیا کہ خدا کے بیٹے ہوسکتے ہیں اور چونکہ بقول اس کے خدا کے لئے صاحبِ اولاد ہونا جائز ہے لہٰذا اس کے بعد اس کے بیٹے بھی خدا ہوسکتے ہیں۔

اس طرح اقتدار کی محبت اور جذبۂ برتری کے باعث الحکیم نے اپنی خلافت میں مکتبِ جعفری کو بظاہر ایک بڑا دھچکا پہنچایا اور اسی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ یہ ظاہری دھچکا واقعی اور باطنی پہلو نہیں رکھتا تھا کیونکہ کوئی بھی بافہم شیعہ خلیفہ کو تسلیم نہیں کرتا تھا اور جانتا تھا کہ اس کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ البتہ سب جان یا روزی' روٹی یا دونوں کو بچانے کے لئے چپ رہنے پر مجبور تھے۔

الحکیم محسوس کرتا تھا کہ بافہم و سمجھدار طبقے نے اگر سکوت اختیار کیا ہے تو یہ اس کی خدائی قبول کرنے کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ خوف ہے۔ لہٰذا اسے اپنی خدائی کو لوگوں کے دلوں میں اتارنے کے لئے امام جعفر صادقؑ کی شیعی ثقافت سے ملتی

جلتی کوئی چیز ایجاد کرنا چاہیئے جس سے اس کی خدائی کا عقیدہ راسخ ہوجائے۔چنانچہ اس نے اپنی خدائی کو ثابت کرنے والے مکتب کو وجود میں لانے کے لئے چند صاحبانِ علم و فضل کو حکم دیا کہ اس کے کتب خانے میں جمع ہوں اور ایک دوسرے سے مدد لے کر ایسی کتاب لکھیں جو اس کی خدائی کو ثابت کرے' اس کے پیروؤں کی مذہبی پشت پناہ ہو۔ باالفاظ دیگر اس مقصد کے لئے قرآن جیسی کوئی کتاب تصنیف کی جائے۔

ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جو لوگ خلیفہ کی طرف سے اس کام پر مامور ہوئے وہ خود اس کتاب پر عقیدہ رکھتے تھے یا نہیں؟

لیکن کیونکہ مسلمان اور مذہبِ شیعہ سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم تھے ورنہ یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ انہیں کتاب لکھنے کا حکم دیتا ہم یہ تصور نہیں کرتے کہ وہ دل سے اس کی خدائی کے معتقد تھے۔ خاص طور سے اس زمانے میں جب کہ خلیفہ تندرست بھی نہیں تھا اور اس کمیٹی کے ارکان یقینی طور پر سمجھتے تھے کہ جو خدا مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق آٹھ صفاتِ ثبوتیہ اور آٹھ صفاتِ سلبیہ کا حامل ہو اسے بیمار نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ صحت و بیماری اس کی مخلوقات کی ایک صفت ہے جو جسم رکھتے ہیں' ماحول سے متاثر ہوتے ہیں' غذا استعمال کرتے ہیں اور ماحول یا غذا کے مضر اثرات انہیں بیمار کرتے ہیں۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جب الحکیم نے یہ قبول کرلیا کہ خدا صاحبِ اولاد ہوسکتا ہے اور یہ مان لیا کہ مسیحؑ خدا کے فرزند ہیں تو بیت المقدس میں مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے مسیحیوں کو جانے کی اجازت دے دی۔

یہ نظریہ قابلِ اصلاح ہے اور یہ جاننا ضروری ہے کہ جب فاطمی خلفاء ایک سلطنت کے مالک بنے اور منجملہ متعدد علاقوں کے فلسطین بھی ان کے زیرِ نگین آیا تو انہوں نے مسیحی زائرین کو بیت المقدس جانے سے نہیں روکا اور ان سے سفرِ زیارت کے لئے محصول بھی وصول نہیں کرتے تھے۔ بیت المقدس کے مسیحی زائرین پر سخت گیری اس وقت سے شروع ہوئی جب فلسطین پر سلجوقیوں کا تسلط ہوا اور بیت المقدس ان کے زیرِ

اقتدار آگیا۔ یہ مسیحیوں کے مقدس مقامات پر قبضے کے بعد بیت المقدس جانے والے مسیحی زائرین سے محصول وصول کرتے تھے اور بتدریج اس میں اتنا اضافہ کیا کہ زائرین کو اس کی ادائیگی دشوار ہوگئی۔

۱۰۹۵ء میں مسیحی کلیسا کے سربراہ پوپ اور بن دوئم نے کیتھولک مذہب کی بڑی کانفرنس میں جو فرانس کے شہر کلرمول میں منعقد ہوئی تھی کہا کہ آج ایک زائر جب زیارت کے لئے فرانس سے بیت المقدس جاتا ہے اور اسے آمد و رفت کے اخراجات سے تین گنا زیادہ رقم بیت المقدس میں داخلے کے لئے ادا کرنا پڑتی ہے۔ اگر اس مقررہ محصول سے ایک پیسہ بھی کم ہوتا ہے تو اسے جانے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ اب مسیحیوں کی آزادی کے ساتھ بیت المقدس جاسکنے کے لئے جنگ کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے' چنانچہ یہی وہ شخص تھا جس نے پہلی صلیبی جنگ کے لئے پیشقدمی کی اور اسی وقت ۱۰۹۵ء میں سلجوقیوں سے مقابلے کے لئے ایک لشکر روانہ کیا اور اس لشکر کے جانے اور واپس آنے کی مدت نے ۱۰۹۹ء تک طول کھینچا لیکن بیت المقدس کو سلجوقیوں سے آزاد نہیں کراسکا۔

اس فوج نے فلسطین میں سخت شکست کھائی اور باقی ماندہ سپاہی دردناک حالت میں یورپ واپس پہنچے۔ یورپ اور دنیا کی تاریخ میں یہ جنگ پہلی صلیبی جنگ کہی گئی' کیونکہ جتنے مسیحی اس سفر اور لڑائی میں شریک تھے انہوں نے صلیب کی شکل کا ایک کپڑے کا ٹکڑا اپنے لباس پر ٹانک لیا تھا۔ مسیحیوں نے اس پہلی جنگ سے کچھ تلخ تجربے حاصل کئے جن سے انہوں نے بعد کی صلیبی لڑائیوں میں فائدہ اٹھایا۔

بہرحال فاطمی خلفاء کے دور تک جب فلسطین سلجوقیوں کے تصرف میں نہیں آیا تھا کوئی شخص مسیحی زائروں کو نہ بیت المقدس جانے سے روکتا تھا نہ ان سے محصول وصول کرتا تھا۔

الحکیم کے بارے میں اس بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس کا خدائی کا دعویٰ بھی امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کو متزلزل اور ختم نہیں کرسکا۔ اور اس کی زندگی

نے بھی اس قدر وفا نہیں کی کہ اس کی خدائی کو ثابت کرنے والی کتاب مکمل ہوجاتی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے عہدِ حیات میں جتنی کتابیں لکھی جاچکی تھیں وہ کیا ہوئیں۔

الحکیم کے زمانے کی ایک اصطلاح "قیامت القیامہ" کی شکل میں رہ گئی کہ جس سے حسن صباح نے الموت میں اپنے اقدام کے بعد استفادہ کیا۔

الحکیم کا مقصد یہ تھا کہ جب اس کی خدائی کو ثابت کرنے والی کتاب کی تکمیل ہوجائے گی تو وہ "قیامت القیامہ" کا اعلان کرے گا یعنی یہ کہ دنیا اپنی حالت بدل چکی ہے اور عالمِ ہستی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوچکا ہے۔ اس دور میں اس کی خدائی پختہ ہوجائے گی۔ سب کا فرض ہوگا کہ اسے اپنا خدا سمجھیں اور اس کی یہ کتاب قرآن کی جگہ لے سکے گی۔

لیکن اس کی موت سے یہ منصوبہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور اگرچہ اس کے بعض فاطمی خلفاء نے غلو سے کام لیا لیکن اس حد تک نہیں پہنچ سکا اور ان میں سے کسی نے خدائی کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔

جب حسن صباح نے پانچویں صدی ہجری کے نیمۂ آخر میں الموت کے اندر اپنی تحریک کو آگے بڑھایا تو "قیامت القیامہ" کے اعلان کی کوشش کی تاکہ لوگ سمجھیں کہ عالمِ وجود میں ایک نیا دور شروع ہوا ہے۔

---☆---☆---

زمانہ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں

امام جعفر صادقؑ کے محضرِ درس میں جو مسائل زیرِ بحث آئے ان میں زمانے کا مسئلہ بھی ہے' امام جعفر صادقؑ نے حکمت کا درس دیتے ہوئے فلسفے کے متعدد مسائل کے ضمن میں زمانے کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ فلسفے میں زمانے کی بحث قدیم مباحث میں سے ہے اور قدیم یونان میں فلسفی بحث کے آغاز سے ہی یہ موضوع حکماء کا مرکزِ توجہ رہا ہے بلکہ آج تک اس کی بحث ختم نہیں ہوئی ہے' قدیم یونان کے چند فلسفی یہ نہیں مانتے تھے کہ زمانے کا وجود ہو سکتا ہے لیکن بعض اس کے وجود کے قائل تھے۔ جو لوگ وجودِ زمانہ کے منکر تھے وہ کہتے تھے کہ زمانہ ذاتی موجودیت نہیں رکھتا اور تبعی موجودیت کا حامل بھی نہیں ہے بلکہ یہ دو حرکتوں کا درمیانی فاصلہ ہے۔ یہ فاصلہ اگر ایک انسان جیسی باشعور اور حسّاس مخلوق کی طرف سے محسوس کیا جائے تو اس کے سامنے زمانے کی شکل میں آتا ہے' ورنہ محسوس نہیں ہوتا' لہٰذا یہ تبعی موجودیت کا حامل بھی نہیں ہے جس سے ہم تسلیم کریں کہ اس کا وجود دوسری چیز کی تبعیت پر قائم ہے۔

ایک بے شعور اور بے حس وجود دو حرکتوں کا درمیانی فاصلہ محسوس نہیں کرتا۔ آیا جانور زمانے کے موجود ہونے کا احساس رکھتے ہیں؟ حکمائے یونان کہتے تھے کہ تمام جانور یا ان کی بعض انواع زمانے کو محسوس کرتی ہیں' کیونکہ وہ وقت کو پہچانتی ہیں۔ اگر وہ

زمانے کا احساس نہ کریں تو وقت کو نہ پہچان سکیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی وقت شناسی، بھوک یا طلوعِ صبح یا غروبِ آفتاب کی وجہ سے ہو، لیکن بہرحال جیسا کہ ہم بخوبی مشاہدہ کرتے ہیں بعض اقسام کے جانور وقت شناس ہوتے ہیں اور اس چیز سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ زمانے کا احساس کرتے ہیں۔

یونانی فلسفی زمانے کی ذاتی غیر موجودگی کے ثبوت میں جو دلائل پیش کرتے تھے ان میں سے ایک دلیل یہ تھی کہ انسان جس وقت بے ہوش ہوجاتا ہے تو زمانے کی رفتار محسوس نہیں کرتا۔ چنانچہ اگر کئی شب و روز بے ہوش رہے تو ہوش میں آنے کے بعد وہ نہیں سمجھ پاتا کہ اس حالت میں اس پر کتنی مدت گزری ہے۔ اگر زمانہ ذاتی موجودیت کا حامل ہوتا تو ہوش میں آنے کے بعد محسوس ہونا چاہئے تھا کہ کتنے دنوں تک بے ہوشی طاری رہی۔ اگر گہری نیند طاری ہوجائے تب بھی بیداری کے بعد محسوس نہیں کیا جاسکتا کہ کتنی دیر تک سوئے ہیں بجز اس صورت کے کہ دن میں سورج اور رات میں ستاروں کے ذریعے اندازہ کریں۔

وجودِ زمانہ کے حامی کہتے تھے کہ زمانے میں بہت چھوٹے چھوٹے ذرّات ہوتے ہیں اور وہ اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ ہم انہیں محسوس نہیں کرتے اور حواسِ باصرہ، لامسہ اور سامعہ وغیرہ ان کے ادراک پر قادر نہیں ہیں۔ زمانے کے ذرّات ہمیشہ متحرک رہتے ہیں اور ایک طرف سے آکر دوسری طرف جاتے ہیں ہم اگرچہ ان کی رفتار محسوس نہیں کرتے لیکن خود اپنے اندر زمانے کے گزرنے کو زندگی کے ادوار کی تبدیلی کی صورت میں محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بچپن کے دور سے جوانی کے دور میں پھر رشد و کمال اور اس کے بعد ضعیفی اور پیرانہ سالی کے عہد میں پہنچتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے گرد و پیش ہمارا مشاہدہ ہے کہ بچے جو پہلے شیرخوار تھے بڑے ہوکر جوانی کے مرحلے میں داخل ہوگئے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مرغی کے چوزے اور بکری کے بچے بڑے ہوجاتے ہیں اور چھوٹے پودے وقت گزرنے پر تناور درخت بن جاتے ہیں۔

جو لوگ زمانے کے ذاتی وجود پر عقیدہ رکھتے تھے وہ کہتے تھے کہ زمانے کی دو قسمیں

ہیں۔ ایک وہ جس کے ذرات گزرتے رہتے ہیں اور ہم اس کا احساس رکھتے ہیں اور یہ وہی ہے جو درختوں اور جانوروں کے تغیر کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہے جس کے ذرات گزرتے ہیں بلکہ ان مٹی یا ریت کے ذروں کے مانند جو نہروغیرہ میں تہ نشین ہوجاتے ہیں' باقی رہتے ہیں۔ اس قسم کے زمانے میں حرکت نہیں ہوتی جس سے وہ ایک جگہ سے آئے اور دوسری جگہ چلا جائے۔ اس غیر متحرک اور ساکن زمانے کو ابدیت کہتے ہیں۔

یونان کے قدیم فلسفیوں کے نزدیک ابدیت خداؤں کا زمانہ ہے اور متحرک زمانہ انسان اور دیگر موجوداتِ عالم کا اور چونکہ خداؤں کے لئے زمانہ بے حرکت اور ساکت ہے لہٰذا ان کی حالت میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا لیکن نباتات و حیوانات اور انسان چونکہ متحرک زمانے سے متعلق ہیں لہٰذا وہ بدلتے رہتے ہیں اور اس تغیر کی کسی شکل کو روکا نہیں جاسکتا۔ اگر کسی روز درخت یا جاندار کی شکل میں تبدیلی کو روکا جاسکے تو وہ خداؤں کی منزل میں پہنچ جائے گا' کیونکہ بے حرکت و ساکن زمانے سے بہرہ مند ہوگا۔

آیا یہ ممکن ہے کہ ایسا واقعہ پیش آئے اور وہ نباتات و حیوانات غیر متحرک اور ساکن زمانے سے بہرہ مند ہوں یعنی یہ موجودات جن میں انسان بھی شامل ہے خداؤں کے مانند ہوجائیں؟

حکماء یونان کہتے تھے کہ ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔ اور یہ وہی یونانی عرفان ہے جس کے بعض حکمائے یونان مرید تھے اور چاہتے تھے کہ خود کو خداؤں کے درجے تک پہنچادیں چنانچہ ان میں سے ہر ایک حصولِ مقصد کے لئے ایک راستہ اختیار کرتا تھا مثلاً ایک صاحبِ اختراع فلسفی زانن جورواقی کے نام سے مشہور تھا (کیونکہ آتن کے رواق میں درس دیتا تھا) خداؤں کے درجے تک پہنچنے کو اس چیز پر منحصر سمجھتا تھا کہ نفس کشی کی جائے اور اپنے اندر ہوا و ہوس کو فنا کردیا جائے۔

وہ کہتا تھا کہ آتن جیسے جمہوری شہروں میں صرف قانون کے ذریعے آزادی حاصل نہیں کی جاسکتی بلکہ آزادی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب افراد جہادِ اکبر کریں یعنی

اپنے نفس سے جہاد کریں۔ جس وقت نفس مرجاتا ہے اور ہوا و ہوس کی سرکشی اشخاص کو انفرادی اور اجتماعی حقوق پر دست درازی کے لئے آمادہ نہیں کرتی تو سب لوگ آزادی سے بہرہ مند ہونے لگتے ہیں۔

دوسرا فلسفی اپیکو جوزانن رواقی سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل پیدا ہوا اور ۲۷۰ قبل مسیح میں انتقال کرگیا ساکت اور بے حرکت زمانے سے استفادہ کرنے اور خداؤں کی منزل تک پہنچنے کی یہ صورت سمجھتا تھا کہ انسان تمام نعمات اور عطایا سے مستفید ہو لیکن اعتدال کی حدود میں۔

اس کے ہم عصر دوسرے فلسفی ڈیوژن نے ساکن اور غیر متحرک زمانے سے فائدہ اٹھانے اور خداؤں سے ملنے کا یہ طریقہ بتایا کہ ہر چیز سے دست بردار ہوکر ایک گوشے میں زندگی بسر کی جائے۔ چنانچہ ایک روز جب اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا اپنے چلّو سے پانی پی رہا ہے تو اپنا پانی پینے کا چھوٹا سا لکڑی کا پیالہ بھی پھینک دیا اور کہا کہ یہ دنیاوی سامانِ آرائش میں سے ایک چیز ہے جو خداؤں سے ملحق ہونے میں حائل ہے۔

اس جگہ یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ یونان اور مشرقی ممالک کے عرفان میں خداؤں تک پہنچنے کی ایک کلّی راہ دکھائی گئی ہے اور وہ نفسانی ہوا و ہوس پر قابو رکھنا ہے۔ چنانچہ اس حیثیت سے قدیم یونان اور قدیم مشرق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق صرف خواہشِ نفس کی روک تھام کے پیمانے میں ہے۔ بعض عرفاء مثلاً یونان میں ڈیوژن صرف شرمگاہوں کے چھپانے کے علاوہ دوسرے کپڑے کو خداؤں سے ملحق ہونے میں مانع سمجھتا تھا۔ یہ تصور کہاں سے آیا ہے جو یونان اور مشرق میں ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہخامنشیوں سے قبل یونان اور مشرق کے درمیان کوئی علمی و ادبی رابطہ موجود نہیں تھا۔ یہ رابطہ ہخامنشیوں کے دور سے شروع ہوا ہے لہٰذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ خدا بننے کے لئے نفس کے ساتھ جہاد کرنے کا خیال مشرق سے یونان پہنچا یا یونان سے مشرق کی طرف آیا۔

یہ خیال چین کے اندر کنفیوشس، ہندوستان کے اندر مہاتمابدھ اور ایران کے اندر

زردشت کی مذہبی تعلیمات میں موجود نہیں ہے اور انہوں نے یہ نہیں کہا ہے کہ نفس کشی کرو تاکہ خدائی کے مرتبے پر پہنچ جاؤ بلکہ یہ تصور یونان اور مشرق کے عرفانی مکاتب کے اندر وجود میں آیا' بغیر اس کے کہ دونوں کے درمیان کوئی ثقافتی اور فکری رابطہ موجود رہا ہو۔

آیا اس موضوع سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ عرفان کی جانب رجحان انہیں لوگوں کے درمیان ابھرا جو دنیاوی اقتدار سے محروم تھے اور خود کو کمزور محسوس کرتے تھے۔ لہٰذا وہ کہنے لگے کہ خدا سے ملنے کا راستہ ہوا و ہوس سے پرہیز اور نفس کے خلاف جہاد ہے اور اگر اس رجحان کے حامل اس طبقے کے افراد ہوتے جو دنیاوی لحاظ سے صاحبِ اقتدار تھا تو وہ خدا سے اتصال کے لئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتے؟ لیکن کیونکہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض اوقات صاحبانِ اقتدار بھی عرفان کی جانب مائل ہوتے تھے اور ہر طرح کی آزادی اور خود مختاری کے باوجود اپنے نفس پر قابو رکھتے تھے۔ لہٰذا مذکورہ بالا خیال ایک بلا استثناء اصول نہیں کہلا سکتا۔ بعد کے ادوار میں حکماء زمانے کے منکر ہوئے اور انیسویں صدی عیسوی میں یہ انکار علمائے یورپ کے درمیان عام ہوگیا۔ وہ کہنے لگے کہ زمانے کا کوئی وجود نہیں ہے جو کچھ ہے وہ صرف مکان ہے کچھ لوگ مکان کے بھی منکر ہوگئے اور انہوں نے کہا کہ مکان بذاتِ خود کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس کا وجود تبعی اور مادے کا محتاج ہے۔ اگر مادہ موجود ہے تو مکان ہے ورنہ نہیں۔

عام افراد کی نگاہوں میں یہ نظریہ محسوسات کا انکار تھا اور ہے جو شخص چند میٹر لمبے' چوڑے اور اونچے کمرے میں بیٹھا ہو اس کے طول و عرض اور بلندی کو دیکھ رہا ہو اور محسوس کررہا ہو کہ وہ کمرہ ایک مکان ہے وہ اس کو تسلیم نہیں کرسکتا کہ مکان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن انیسویں صدی نیز عہدِ حاضر کے چند دانشور وجودِ مکان کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں جو کچھ مکان کی صورت میں نظر آتا ہے اور طول و عرض و عمق رکھتا ہے وہ مکان نہیں بلکہ مادہ ہے اور یہ مادہ ہی ہے جو مکان کو وجود میں لاتا ہے۔

اس سے زیادہ واضح عبارت میں یہ کہ مادہ خود مکان ہے۔ جہاں مادہ ہوگا وہیں مکان ہوگا اور جہاں مادہ نہ ہوگا مکان بھی نہ ہوگا۔

جب مکان کا انکار کرنے والے کسی دانشور سے پوچھا جاتا ہے کہ اگر مکان نہیں ہے تو ہوائی جہاز جو بہت تیزی کے ساتھ ہزاروں کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے ہیں اور ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی طرف جاتے ہیں وہ کس چیز میں پرواز کرتے ہیں؟ تو جواب دیتے ہیں کہ مادے میں۔

عام افراد کے محسوسات اور عقول اس بات کو قبول نہیں کرسکتیں کہ فضائی راکٹ جو آج زہرہ اور مریخ جیسے سیاروں کی طرف جارہے ہیں مادے میں پرواز کرتے ہیں کیونکہ زمین سے دو یا تین ہزار میٹر کے فاصلے تک تو شاید ہوا (مادہ) کے ذرّات موجود ہوں لیکن اس کے بعد ہوا میں ذرّات موجود نہیں ہیں اور جس دائرے میں یہ راکٹ پرواز کرتے ہیں ایک خالی فضاء ہے اور اس میں موجوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں پائی جاتی جیسے نور کی موجیں' برقی موجیں اور مقناطیسی موجیں اور قوتِ جاذبہ کی موجیں۔ وہاں مادے کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا جس میں فضائی راکٹ پرواز کریں۔ لیکن یہ مخالفینِ مکان کہتے ہیں کہ یہ فضاء جس میں راکٹ پرواز کرتے ہیں اس فاصلے کی مانند ہے جو ایٹم اور اس کے الیکٹرانوں کے درمیان موجود ہے۔ ایٹم اور اس کے الیکٹرانوں کے فاصلے کا تناسب سورج اور سیاروں کے فاصلے کے مانند ہے۔ ایٹم کے اندر یہ فاصلہ جزو مادہ ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ مادے کا جزو نہیں ہے۔

اسی طرح جو فاصلہ زمین و سورج اور زہرہ و سورج وغیرہ کے درمیان موجود ہے وہ بھی جزوِ مادہ ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ قوتِ جاذبہ اس سے گزرتی ہے اور قوتِ جاذبہ مادے سے یا مادہ قوتِ جاذبہ سے جدا نہیں ہے۔

اس نظریئے میں جیسا کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ انرجی اور مادے کا فرق ہی ختم ہوگیا ہے اور دونوں ایک ہی سمجھ لئے گئے ہیں۔ اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قوتِ جاذبہ مادہ ہے اور مادہ قوتِ جاذبہ ہے اور ان میں باہم کوئی فرق نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دانشور اٹھارہویں صدی عیسوی ہی سے اس جانب متوجہ ہوگئے تھے کہ مادہ اور انرجی ایک ہی چیز کی دو شکلیں ہیں۔ لیکن مادے کے خواص کو انرجی کے خواص سے الگ جانتے تھے۔

البتہ جدید علمِ طبیعیات میں مادہ اور انرجی کی تعریف اس طرح سامنے آئی ہے کہ نہیں کہا جاسکتا کہ مادہ کیا ہے اور انرجی کیا چیز؟

بیسویں صدی کے آغاز تک کہا جاسکتا تھا کہ مادہ انرجی کے مجموعہ سے عبارت ہے اور انرجی عبارت ہے مادے کی امواج سے' لیکن اب بھی یہ تعریف مادہ اور انرجی کی شناخت کے لئے کافی نہیں ہے۔کیونکہ جب قوتِ جاذبہ ہی مادہ ہوگئی تو مادہ جو آج تک انرجی کے مجموعے کی شکل میں پہچانا جاتا تھا لامتناہی ہوجائے گا۔ اور اس تعریف کے تحت لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ عالمِ ہستی میں مادے کے علاوہ اور کوئی چیز موجود نہیں ہے اور ہوائی جہاز یا راکٹ مادے میں پرواز کرتے ہیں۔

لیکن اس چیز کا قائل ہونا کہ مکان کا کوئی وجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ مادہ ہے ابھی تھیوری کے مرحلے سے آگے نہیں بڑھا اور علمی قانون کا حامل نہیں بنا ہے۔ البتہ ہمیں اس میں شبہ نہیں ہے کہ قوتِ جاذبہ کی لہروں کی سرعت میں جسم لامتناہی ہوجاتا ہے۔ اور اس نظریئے کی بنیاد پر مادہ لامتناہی ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ کائنات میں مکان کا وجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے مادہ ہے'ان کے نظریئے کو واضح کرنے کے لئے ہم ایک اور مثال دے رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کائنات میں ایک کھرب کہکشائیں موجود ہیں جو محض تخمینہ ہے اور وہ بھی حقیقت سے قریب نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے ان کی تعداد اس سے دو چند یا کئی گنا زیادہ ہو۔ ان کہکشانوں نے خود اپنے اندازے کے لحاظ سے کائنات میں مکان پیدا کیا ہے اور خود ہی اس میں جاگزیں ہوئی ہیں۔

اب ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک ہزار کہکشائیں اور پیدا ہوجائیں جب کہ ہماری عقل کہتی ہے کہ اب ان مزید کہکشانوں کے لئے جگہ نہیں ہے' کیونکہ جس قدر مکان

موجود تھا وہ موجودہ کہکشانوں سے پر ہوچکا ہے' یہ عالم ایک بڑے آڈیٹوریم کی مانند ہے جس کی تمام نشستیں پر ہوچکی ہیں اور جس میں مزید کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنے والے کہ مکان موجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے مادہ ہے' بتاتے ہیں کہ اگر مزید ایک ہزار ملین کہکشانوں کا وجود میں آنا طے ہوجائے تو ان کا مکان بھی وجود میں آجائے گا اور کہکشانوں کا مکان وہی جرم (یعنی مادہ) ہے جو انہیں وجود میں لاتا ہے۔

ماہرینِ طبیعیات کے اس گروہ کا عقیدہ ہے کہ لامتناہی کائنات میں مادے کی موجود مقداروں پر مزید اضافہ کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا۔ جب ہم تماشاگاہ کے ایک ایسے ہال کو پیشِ نظر رکھیں۔ جس کا طول و عرض اور بلندی لامحدود ہو' اور اس کی نشستوں کا شمار بھی محدود نہ ہو۔تو اگر موجودہ تماشائیوں پر ایک ملین "یعنی دس لاکھ" تماشائیوں کا اور اضافہ ہوجائے تب بھی جگہ کی تنگی محسوس نہ ہوگی اور ان بعد میں آنے والے دس لاکھ یا دس کروڑ تماشائیوں کے لئے بھی جگہ ہوگی۔

مکان کے وجود سے انکار کرنے اور ہر چیز کو مادہ کہنے والوں میں ہر صاحبِ عقل کے استنباط میں یہ فرق ہے کہ ان کے نزدیک پہلے مکان موجود ہونا چاہئے اس کے بعد اس میں کہکشاں کا وجود قائم ہوگا اور مکان کی غیر موجودگی کے حامی کہتے ہیں کہ جو کہکشاں وجود میں آتی ہے وہی مکان بھی ہے اور خود وہی ابعادِ ثلاثہ یعنی طول و عرض و عمق کا حجم ہمارے محسوسات کی بناء پر اس طرح نظر آتا ہے حالانکہ ایک ایسی باشعور شخصیت جو فقط ایک بُعد یعنی طول کو محسوس کرتی ہے اس کے لئے محال ہے کہ عرض کو بھی محسوس کرسکے اور اس کے لئے ایک مربع جس میں طول و عرض ہے یا ایک دائرہ کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

اسی طرح جو باشعور موجود صرف طول و عرض کا احساس کرتا ہے اور یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایک مربع یا ایک دائرہ کیسا ہوتا ہے اس کے لئے یہ سمجھ لینا محال ہے کہ ایک سہ بُعدی منظر جو طول و عرض اور عمق کا حامل ہے' مثلاً ایک صندوق یا ریل کا ڈبہ کس نمونے کا ہوتا ہے؟

اسی قیاس پر ہم جیسے افراد جو ابعادِ ثلاثہ (طول و عرض و عمق) کا احساس کرسکتے ہیں چوتھے بعُد کو محسوس نہیں کرسکتے' درحالیکہ ریاضی کے ماہرین کو چوتھے بعُد کی موجودگی کا اتنا یقین ہے کہ انہوں نے چار بعُدی حجم کے شمار کے ساتھ ایک چہار بعُدی ہندسہ بھی تجویز کرلیا ہے۔

چونکہ یہ لوگ چوتھے بعُد کے قائل ہیں لہٰذا پانچویں اور چھٹے بعُد کے بھی قائل ہیں۔ لیکن کسی سننے اور پڑھنے والے کے لئے سہ بعُدی حجم کی مانند ان کے وجود کو مجسّم کرکے پیش نہیں کرسکتے۔

جس وقت سے خلا نوردی کا آغاز ہوا مادہ شناسی کے لحاظ سے ماہرینِ طبیعیات کی معلومات میں کچھ مزید اطلاعات کا اضافہ ہوا ہے جن میں ایک یہ ہے کہ کرہ ارضی میں جتنے اجسام ہیں ان سے مسلسل قرمزی رنگ کی لہریں خارج ہوتی ہیں۔ پہلے یہ تصور کیا جاتا تھا کہ قرمزی رنگ کی لہریں صرف گرم اشیاء سے خارج ہوتی ہیں لیکن جو سیارے مستقل طور پر زمین کے گرد گردش کررہے ہیں ان کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کی منجمد برف سے بھی یہ لہریں برابر خارج ہوتی ہیں۔ جن تجربہ گاہوں میں اجسام کو شدید برودت میں رکھا جاسکتا ہے وہاں آزمائش کی گئی ہے کہ بہت ہی سرد جسموں سے بھی یہ لہریں نکلتی ہیں اور اب علمِ طبیعیات کے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کرہ ارض میں کوئی ایسا جسم نہیں ہے جس سے مذکورہ بالا لہروں کا اخراج نہ ہوتا ہو' سوائے اس جسم کے جس کی برودت صفر مطلق کے درجے پر پہنچ گئی ہو اور برودت صفر مطلق درجہ، برودت کا وہ پیمانہ ہے جب مادے کے اندر ذرّات (Molecules) کی حرکت ٹھہر جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رات کے وقت ان دوربینوں کے ذریعے جو قرمزی رنگ کی لہروں یا شعاعوں کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ ہر چیز کو دیکھا جاسکتا ہے اور جن لوگوں کے ہاتھوں میں یہ دوربینیں ہوں ان کی نگاہوں سے شب کے وقت کسی چیز کو پوشیدہ نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ خشک گھاس اور مردہ جانور کے مقابلے میں ہری گھاس اور زندہ

جانور کے جسم سے یہ موجیں زیادہ خارج ہوتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے اب میدانِ جنگ میں کسی ٹینک یا توپ یا بکتر بند گاڑی کو درختوں کی شاخوں یا گھاس وغیرہ سے چھپا کے دشمن کی نگاہوں سے اوجھل نہیں کیاجاسکتا کیونکہ دشمن ایسی دوربین سے جو اشیاء کو ان قرمزی شعاعوں کے توسط سے دیکھنے کے لئے مخصوص ہوتی ہے' دیکھتا ہے کہ ان شاخوں اور پتوں کے مقابلے میں جو جڑوں کے ذریعے زمین سے متصل ہوتے ہیں صرف دسواں حصّہ لہریں خارج ہورہی ہیں لہٰذا سمجھ لیتا ہے کہ یہ شاخیں اور پتے جڑوں کے ذریعے زمین سے ملحق نہیں ہیں' یعنی انہیں کاٹ کر الگ کرلیا گیا ہے اور لازمی طور پر انہیں ٹینک یا توپ یا بکتر بند گاڑی کو پوشیدہ رکھنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

اسی طریقے سے میدانِ جنگ میں سپاہیوں کے جسموں سے بھی مذکورہ قرمزی لہریں یا شعاعیں نکلتی ہیں۔ لہٰذا اس دور میں رات کے وقت انہیں مخالف فوج کے محافظوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رکھاجاسکتا۔ سوائے اس صورت کے کہ ان کے پاس ایسی دوربینیں موجود ہی نہ ہوں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ تمام اجسام سے یہ لہریں خارج ہوتی ہیں؛ سوائے اس جسم کے جس کی برودت صفر مطلق کے درجے پر ہو۔ برودت صفر مطلق کا درجہ ۱۰۰ ڈگری والے (تھرمامیٹر) میں ۲۷۳٫۱ درجہ اور ۴۵۹٫۶ درجہ فارن ہائیٹ بتایا گیا ہے۔

ہنوز یہ درجہ برودت ماہرینِ طبیعیات کے خیالات تک محدود ہے کیونکہ آج تک کسی تجربہ گاہ میں بہت زیادہ دباؤ کے باوجود بھی اتنی برودت پیدا نہیں کی جاسکی ہے۔

دنیا کی تجربہ گاہیں سو ڈگری والے تھرمامیٹر کے ذریعے منفی دو سو بیس درجے تک برودت حاصل کرسکی ہیں' لیکن اس کے بعد اجسام کو مزید سرد کرنے میں بہت مشکلات کا سامنا ہے۔ چنانچہ ایک درجے کے ہر دسویں حصے کے لئے بھی عظیم وسائل کو کام میں لانا ضروری ہے۔

خلاصہ یہ کہ کرۂ ارض میں آج تک برودت صفر مطلق کو وجود میں نہیں لایا جاسکا جس سے معلوم کیا جاسکے کہ اجسام میں ذرّات (Molecules) کا مکمل ٹھہراؤ کیا اثر

دکھاتا ہے؟ اور کیا اس کی وجہ سے ایٹموں میں بھی کوئی اثر پیدا ہوتا ہے؟

کیونکہ مادے سے متعلق معلومات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے لہٰذا خیال کیا جاتا ہے کہ جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہستی ایک لامتناہی مادے کے سوا اور کچھ نہیں اور جو کچھ ہمیں خلاء کی مانند نظر آتا ہے وہ مادے کی اٹھتی ہوئی لہریں ہیں، ان کا قول بے بنیاد نہیں ہے اور اس کے نتیجے میں یہ کہنا کہ مکان کا کوئی وجود نہیں اور جو کچھ موجود ہے صرف مادہ ہے، شاید بے وجہ نہ ہو۔ لیکن جب تک یہ تھیوری علمی قانون کی شکل میں نہیں آتی اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

ہم عصر ماہرینِ طبیعیات میں سے ایک ایزک آسیموف ہیں جو روس میں پیدا ہوئے اور پھر امریکہ ہجرت کر گئے اور اب وہیں ملازمت کر رہے ہیں۔ یہ مکان کے بارے میں ایک جدید نظریہ پیش کرتے ہیں جسے اگر ہم علمی اصطلاحات اور ریاضی کے فارمولوں سے الگ کر کے دیکھیں تو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ مکان عبارت ہے مادے اور اس کی لہروں سے، اس ترتیب سے کہ مادۂ اصلی عبارت ہے ایٹم کے مرکز یا مرکزوں سے۔ ان کے جمع ہونے کے بعد اس مرکز سے مستقل طور پر موجیں خارج ہوتی رہتی ہیں۔ یہ لہریں مرکز کے قریب کثیف ہوتی ہیں اور جس قدر مرکز سے دور ہوتی جاتی ہیں ان کی کثافت کم ہوتی جاتی ہے لیکن ان کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

ہم اس ایٹمی مرکز کو چراغ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ چراغ کے گرد اس کی روشنی زیادہ اور تیز ہوتی ہے، لیکن ہم جس قدر چراغ سے دور ہوں اس کی روشنی کم ہوجاتی ہے لیکن اس کی تیز رفتاری میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اگر ہم چراغ سے اس قدر دور ہوجائیں کہ اس کی روشنی نظر نہ آئے تب بھی یہ روشنی موجود رہتی ہے۔

اور اس کی لہریں اسی تیزی سے یعنی تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے چاروں طرف پھیلتی رہتی ہیں۔ صرف ہماری آنکھ تک نہیں پہنچتیں۔

ہماری آنکھ، کان اور قوتِ لامسہ لہروں کو محسوس کرنے میں ایک حد رکھتی ہیں۔ اگر لہروں کی حرکت اس حد میں نہ ہو تو نہ ہماری آنکھ روشنی کو دیکھتی ہے اور نہ ہمارے

کان آواز کو سنتے ہیں۔ اور نہ ہمارے بدن کی جلد گرمی کا احساس کرتی ہے۔ جیسے چراغ جسے ہم گھروں میں روشن کرتے ہیں۔ اگر ہم گھر سے دور چلے جائیں تو ان میں سے کسی کی روشنی ہماری آنکھ میں نہیں پہنچتی لیکن وہ باقی رہتی ہے اور پہلے کی طرح تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔

پہلے لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ روشنی کی لہریں مستقیم سفر کرتی ہیں۔ لیکن آج ہمیں معلوم ہے کہ ایسے مادے کے آس پاس جس کی قوتِ جاذبہ قوی ہو یہ لہریں کمزور پڑ جاتی ہیں۔

آیا سورج کی قوتِ جاذبہ جو بہت زیادہ ہے اور جو چراغ کی روشنی کے سفر کو کمزور کردیتی ہے۔ اسے جذب بھی کرتی ہے؟

علمِ طبیعیات جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ سورج اتنی طاقت ور قوتِ جاذبہ کے باوجود جس سے چراغ کی روشنی کا سفر کمزور پڑجاتا ہے اسے جذب نہیں کرتا۔

ہر ستارے کی قوتِ جاذبہ اس کے جسم سے مناسبت رکھتی ہے اور سورج کا جسم اتنا بڑا ہے کہ نظامِ شمسی میں موجود تمام اجرام اور ستاروں کی مجموعی جسامت اس کے مقابل (۱۰۰) حصوں میں سے ایک کے سویں حصے کے چودہ سو حصوں میں سے ایک کے برابر ہے یعنی اگر سورج کے سو ٹکڑے کیے جائیں اور پھر ان ٹکڑوں کے مزید سو، سو ٹکڑے کیے جائیں تو سورج کے گرد گھومنے والے سیاروں کی مجموعی جسامت ثانی الذکر سویں حصّے کا چودہ سواں حصہ ہوگا۔

ہمیں اجسام کی جسامت اور ان کے حجم میں فرق رکھنا چاہئے۔ ایک دھونکنی جب ہوا سے بھر جاتی ہے تو اس کا حجم بڑھ جاتا ہے لیکن اس کی جسامت بہت کم ہوتی ہے۔

اشیاء کی جسامت سے مراد وہ چیز ہے جسے ہم وزن کے ذریعے محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ جو جسم جس قدر وزنی ہوگا اسی قدر اس کی جسامت زیادہ ہوگی اور جس قدر کسی شے کی جسامت زیادہ ہوگی اسی قدر اس کی قوتِ جاذبہ بڑھ جائے گی اور سورج کی

جسامت کیونکہ بہت زیادہ ہے لہٰذا وہ طاقت ور قوتِ جاذبہ بھی رکھتا ہے۔ لیکن سورج اپنی تمام تر قوتِ جاذبہ کے باوجود گھر کے چراغ کی کمزور روشنی کو جذب نہیں کرسکتا البتہ اس کی لہروں کو ترچھا کردیتا ہے اور سورج کی قوتِ جاذبہ کا گھر کے چراغ کی روشنی کو جذب نہ کرسکنے کا سبب اسکی غیر معمولی تیز رفتاری ہے کیونکہ یہ ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کی رفتار سے سورج کے کنارے کو عبور کرتے ہوئے گزر جاتی ہے۔

اگر آپ سوال کریں کہ چراغ کا نور سورج کے کنارے کو عبور کرنے کے بعد کہاں جاتا ہے تو ہمارا جواب ہوگا کہ نظامِ شمسی سے گزر جاتا ہے پھر ایک دوسرے سورج کے کنارے سے عبور کرتا ہے اور اس کی لہروں کا سفر ترچھا ہوجاتا ہے لیکن اس سورج سے بھی دور چلا جاتا ہے۔

آیا یہ ممکن ہے کہ کسی سورج کی قوتِ جاذبہ اتنی زیادہ ہو کہ ہمارے چراغ کی روشنی تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار کے باوجود اس سے فرار نہ کرسکے اور اس میں جذب ہوجائے؟

تو جواب یہ ہے کہ یہ صورتِ حال ممکن ہے اور اگر چراغ کی روشنی کسی کوٹولہ کے کنارے سے عبور کرے تو اسی میں جذب ہوجاتی ہے۔

کوٹولہ ایک نام ہے جسے بیسویں صدی کے آغاز میں منجمین نے ان ستاروں کے لئے وضع کیا ہے جن کی جسامت اس قدر پیوستہ پرتوں پر مشتمل اور قوتِ جاذبہ اتنی زیادہ ہے کہ روشنی ان سے گریز نہیں کرسکتی اور ان میں جذب ہوجاتی ہے۔ کوٹولہ ستاروں کا جسم اس قدر گھٹا ہوا ہوتا ہے کہ جس کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اور ان ستاروں کے باہم پیوستہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان کے ایٹم صرف مرکز (پروٹون) رکھتے ہیں' الیکٹرون نہیں رکھتے۔

یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ایٹم جو ایک مادے کا سب سے چھوٹا جزو ہوتا ہے تناسب کے لحاظ سے ہمارے نظامِ شمسی کی مانند ہے ایٹم کا مرکز پروٹون ہے اور اس کے الیکٹرون اس کے گرد چکر لگاتے ہیں اور الیکٹرون اور پروٹون کے درمیانی فاصلے کا تناسب وہی ہے جو

منظومہ شمسی کا تناسب ہے۔ اگر الیکٹرون اور پروٹون کا درمیانی فاصلہ ختم کردیا جائے تو کرۂ زمین کی جسامت ایک فٹ بال کے برابر رہ جائے گی لیکن اس کا وزن کرۂ زمین کے مساوی ہوگا۔

کوٹولہ ستاروں میں ایٹم اپنی خالی فضا سے محروم ہوچکے ہیں اور ان میں الیکٹرون نہیں ہیں فقط پروٹون کے ذرّے باقی رہ گئے ہیں، جنھوں نے ایک دوسرے سے پیوستہ ہو کر ایک گٹھے ہوئے جسم کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اور مذکورہ بالا مثال کے مطابق ان کا فٹ بال کے برابر گولا آج کے کرۂ زمین کا ہم وزن ہے۔

کیونکہ قوتِ جاذبہ جسامت کی مناسبت سے ہوتی ہے لہٰذا کوٹولہ ستاروں کی قوتِ جاذبہ اتنی زیادہ ہے کہ گھر کے چراغ کا نور اس سے فرار نہیں کرسکتا اور اسی دلیل کی بنا پر ہمیں یہ ستارے تاریک نظر آتے ہیں۔

ہم فرض کرتے ہیں کہ اگر ہم اپنا چراغ لے کر ان میں سے کسی ستارے تک پہنچ جائیں اور چونکہ وہاں اندھیرا ہے لہٰذا روشنی کے لئے اس چراغ کو جلائیں تب بھی (اگر وہ چراغ روشن ہوسکے) اس کی فضا تاریک نظر آئے گی کیونکہ کوٹولہ کی قوتِ جاذبہ اتنی زیادہ ہوگی کہ وہ ہمارے چراغ کے نور کو حرکت کرنے اور اپنے اطراف میں پھیلنے اور روشنی دینے کی اجازت نہیں دے گی۔ کوٹولہ ستاروں کے تاریک ہونے کا سبب بھی یہی ہے کہ نور کی لہریں ان میں جذب ہوجاتی ہیں۔ ان کے ارد گرد لہروں کی صورت میں نہیں رہتی۔

منجمین ابھی کچھ دنوں پہلے تک ان ستاروں کو ان کے گرد و پیش کے ستاروں کی روشنی سے دیکھتے تھے لیکن اب ریڈیو ٹیلسکوپ ایجاد ہونے کے بعد ان سے کام لے رہے ہیں۔

اگر چراغ کا نور کسی کوٹولہ ستارے میں جذب نہ ہو تو مستقل طور پر اپنا راستہ طے کرتا رہتا ہے اور ایک لہر کے ساتھ مثلاً کبھی داہنی طرف، کبھی بائیں طرف، کبھی اوپر کی طرف اور کبھی نیچے کی جانب منحرف ہوکر چلتا رہتا ہے۔

ایزک آسیموف کہتا ہے کہ راستہ (مکان) اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا' نور خود اس کو وجود میں لاتا ہے اور نور کی لہروں کی حرکت ہی مکان ہے۔

اس ماہرِ طبیعیات کے نظریئے کی بناء پر مکان کا کوئی وجود نہیں جب تک کہ نور اس میں راستہ نہ بنائے۔ بلکہ خود نور نے اپنی موجوں سے مکان کو وجود بخشا ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ چراغ کی روشنی کس حد تک مسافت طے کرتی ہے اور کہاں تک جاتی ہے؟

تو علمِ طبیعیات ہمیں بتاتا ہے کہ اس کی مسافت کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ یہ اس قدر مسافت طے کرتی ہے کہ مادے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ چراغ کی روشنی جو انرجی ہے مادے میں کس طرح بدلتی ہے؟ تو علمِ طبیعیات آج تک اس کا جواب نہیں دے سکا ہے۔ اگر علمِ طبیعیات اس سوال کا جواب دے سکے تو ایک لحظہ میں سائنس ایک لاکھ سال کا فاصلہ طے کرلے گی' کیونکہ علمِ طبیعیات میں سرالأسرار یہی ہے اور خلقت کا عظیم راز اسی سوال کا جواب ہے کہ انرجی مادے میں کیونکر تبدیل ہوجاتی ہے؟

مادے کی انرجی میں تبدیلی ہمارے لئے ایک عام بات ہے۔ ہم روزوشب کارخانوں ' بحری جہازوں ' گاڑیوں اور گھروں میں یہاں تک کہ اپنے جسموں میں مادے کو انرجی میں بدلتے رہتے ہیں ' لیکن آج تک انرجی کو مادے میں نہیں بدل سکے اور ہم ابھی تک نہیں جانتے کہ دنیا میں انرجی مادے میں کس طرح بدلتی ہے۔

ہمارے سامنے خلقت کا ایک واضح نمونہ سورج ہے لیکن اس میں بھی انرجی مادے میں نہیں بدلتی بلکہ ایک مادہ دوسرے مادے میں بدلتا ہے اس ترتیب سے کہ ہائیڈروجن کا عنصر ہیلیم (Helium) کے عنصر سے بدلتا ہے اور اس کے نتیجے میں تیز حرارت پیدا ہوتی ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ خود سورج کیونکر پیدا ہوا ہے اور جو کچھ اس سلسلے میں اب تک کہا گیا ہے محض ایک تھیوری ہے جو علمی وقعت نہیں رکھتی۔

ہم یہ نکتہ بھی بیان کرتے چلیں کہ جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ چراغ کی روشنی

ایک طولانی مدت کے بعد مادے میں بدل جاتی ہے تو یہ بھی ایک تھیوری ہے کیونکہ ہم نے اب تک انرجی کو مادے میں تبدیل ہوتے نہیں دیکھا ہے اور قطعی طور سے نہیں کہہ سکتے کہ انرجی مادے میں بدل جائے گی۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مادہ انرجی میں بدل جاتا ہے تو عقلی طور پر اندازہ لگاتے یا فرض کرتے ہیں کہ انرجی بھی مادے میں بدل جاتی ہے۔

البتہ اس گمان و فرضیہ اور علم الیقین کے درمیان بہت فاصلہ ہے اور علم میں اندازے اور فرضیہ پر تکیہ نہیں کیا جاسکتا۔ خلاصہ یہ کہ اس دور کا ماہرِ طبیعیات اور امریکی یونیورسٹی کا استاد ایزک آسیموف وجودِ مکان کا منکر ہے اور کہتا ہے کہ مکان کا کوئی وجود نہیں ہے جو کچھ ہے مادہ یا اس کی موجوں کی حرکت ہے اور ہمارے لئے مکان کا احساس انہیں موجوں پر مبنی ہے۔

کیونکہ یا تو ہم آزاد فضا میں چل رہے ہوتے ہیں یا اپنے کمرے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس دوران لہریں ہمیں اپنی آغوش میں لئے ہوتی ہیں لہٰذا ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی مکان میں ہیں۔ اب اگر یہ لہریں رک جائیں اور ہم ان کی آغوش میں نہ رہیں تو ہمیں اپنا وجود ایک مکان میں محسوس نہ ہوگا۔

آیا یہ ممکن ہے کہ موجیں منقطع ہوجائیں اور ہم (بقول آسیموف) مکان کا احساس نہ کریں؟

یہاں علمِ طبیعیات کہتا ہے کہ نہیں!

کیونکہ سخت اندھیری راتوں میں نور کی وہ لہریں جنہیں ہم نہیں دیکھتے ہمیں آغوش میں لئے ہوئے ہیں اور انتہائی خاموش فضاؤں میں مختلف آوازوں کی موجیں جنہیں ہم نہیں سنتے ہمارے گرد متحرک ہیں اور ان میں سے بعض ہمارے جسموں سے گزرتی ہیں۔

اگر فرض کیا جائے کہ تمام موجیں قطع ہوسکتی ہیں تب بھی عمومی قوتِ جاذبہ کی موج کسی حال میں یہاں تک کہ راکٹوں میں خلابازوں کی بے وزنی کی حالت میں بھی

منقطع نہیں ہوتی اس حالت میں بھی راکٹ کی تیز رفتاری زمین کی قوتِ جاذبہ سے ایک توازن قائم کرتی ہے جو راکٹ سے نکلنے والے خلاباز کو گرنے سے روکتا ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ راکٹ میں یا اس کے باہر خلا باز قوتِ جاذبہ کے زیرِ اثر نہیں رہتے۔

علمِ طبیعیات کے مطابق مادے سے قوتِ جاذبہ کی وابستگی اتنی زیادہ ہے کہ اگر یہ قوت الگ کرلی جائے تو مادہ ہی باقی نہیں رہے گا اور کسی جاندار یا بے جان مخلوق کا قوتِ جاذبہ کی لہریں منقطع ہونے کے بعد ایک لحظہ بھی باقی رہنا محال ہے۔۔۔۔۔۔۔

یہ زمان و مکان کے بارے میں انیسویں اور بیسویں صدی کے ماہرینِ طبیعیات کے نظریئے کا ماحصل ہے۔

اب اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ آج سے ساڑھے بارہ سو سال قبل ایک شخصیّت انہی نظریات کو پیش کرچکی ہے تو کیا وہ لائقِ آفرین نہیں ہے؟ اور کیا وہ اس کی حقدار نہیں ہے کہ ہم اس کی اعلیٰ دماغی کی تعریف و تحسین کریں؟

اور یہ ذات تھی امام جعفر صادقؑ کی جنہوں نے دوسری صدی ہجری کے نیمۂ اوّل میں زمان و مکان کے لئے وہ نظریئے پیش کئے جو آج کے نظریات کے مطابق ہیں باوجودیکہ آپ کے نظریات میں کوئی علمی اصطلاح اور فارمولا نہیں ہے لیکن ہم جدید نظریات سے ان کی مطابقت کرسکتے ہیں۔

آپ کہتے ہیں کہ زمانہ بذاتِ خود موجود نہیں ہے اس کا وجود صرف ہمارے احساسات پر قائم ہے اور زمانہ ہمارے لئے عبارت ہے دو واقعات کے درمیان موجود فاصلے سے۔ آپ کے نظریئے کے مطابق' روز و شب زمانے کے نمونے نہیں ہیں بلکہ زمانے کے علاوہ ہیں اور آج بھی ان سے مستقل مدت معلوم نہیں ہوتی۔ کبھی دن بڑا ہوتا ہے اور رات چھوٹی' کبھی رات بڑی ہوتی ہے اور دن چھوٹا اور کبھی ہم دونوں کو برابر محسوس کرتے ہیں۔

مکان کے لئے آپ کا نظریہ تھا کہ یہ ذاتی نہیں بلکہ تبعی ہے' یہ ہمیں طول و عرض و عمق والی فضاء کی شکل میں نظر آتا ہے اور عمر کے ہر عہد میں اس کا وجود فرق رکھتا

ہے۔ چھوٹے گھر میں رہنے والا بچّہ اس کے احاطے کو وسیع میدان سمجھتا ہے' لیکن بیس سال کے جوان کو وہی گھر بہت چھوٹا نظر آتا ہے اور وہ اس پر تعجب کرتا ہے کہ کل یہ کس قدر وسیع تھا اور آج کیسے چھوٹا اور تنگ ہوگیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں مکان کا وجود تبعی ہے اور آج بھی جیسا کہ ہم نے بتایا کہ ماہرینِ طبیعیات کی ایک جماعت بھی یہی نظریہ رکھتی ہے۔

---☆---☆---

امام جعفر صادقؑ کے نزدیک بعض بیماریوں کے اسباب

امام جعفر صادقؑ کا ایک اور نظریہ جو آپ کی علمی برتری کو ثابت کرتا ہے بعض روشنیوں کے ذریعے بیماری کے انتقال سے متعلق ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ بعض روشنیاں ایسی ہیں جو اگر ایک بیمار سے ہو کر تندرست انسان تک پہنچیں تو اسے بھی بیمار کر سکتی ہیں۔ یہ بات لائق توجہ ہے کہ یہاں ہوا یا میکروب (جس سے دوسری صدی ہجری کے نیمہ اوّل میں لوگ ناواقف تھے) کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ روشنی کا ذکر ہے' وہ بھی ہر روشنی کا نہیں بلکہ بعض روشنیوں کا جو اگر بیمار آدمی سے گزر کر تندرست آدمی پر منعکس ہوں تو ممکن ہے کہ اسے بھی بیمار کر دیں۔

اس نظریئے کو حیاتیات اور فنِ طب کے علماء خرافات اور فضول بات سمجھتے تھے' کیونکہ ان کے عقیدے میں بیمار آدمی سے تندرست آدمی کی طرف بیماری کے منتقل ہونے کا باعث مکروب تھے یا وائرس' چاہے انتقالِ مرض کا وسیلہ حشرات الارض ہوں یا پانی یا ہوا یا وہ بیمار و صحتمند آدمیوں کے درمیان براہ راست مس ہونا۔ مکروب یا وائرس کی تحقیق سے پہلے بیماریوں کے منتقل ہونے کا ذریعہ بُو کو سمجھا جاتا تھا اور قدیم زمانے میں امراض کی سرایت کو روکنے کے لیے تمام اقدامات بُو کی روک تھام کی بنیاد پر کیے جاتے تھے تاکہ کسی مرض کی بُو ایک بیمار سے تندرست انسان تک پہنچ کر اسے بھی بیمار نہ کر دے۔ کسی دور میں کسی شخص نے بھی یہ نہیں کہا کہ بعض روشنیاں اگر بیمار سے

ہوتی ہوئی تندرست تک پہنچیں تو اسے بھی بیمار کردیتی ہیں۔ یہ صرف امام جعفر صادقؑ کا قول ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ دانشمندوں کی جماعت اس نظریئے کو خرافات میں شمار کرتی تھی' یہاں تک کہ جدید علمی تحقیقات نے ثابت کردیا کہ یہ نظریہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس حقیقت کا پتہ پہلی بار سوویت یونین میں لگایا گیا۔

سوویت یونین میں واقع شہر نووا سیبرسک میں' جو طبی' کیمیائی اور حیاتیاتی تحقیقات کے بڑے مراکز میں سے ہے' علمی اور ناقابلِ تردید حیثیت سے ثابت ہوچکا ہے کہ پہلے بیمار خلیوں سے شعاعیں نکلتی ہیں پھر جب ان میں سے ایک قسم کی شعاعیں صحیح و سالم خلیوں پر اپنا اثر ڈالتی ہیں تو انہیں بھی بیمار کردیتی ہیں' بغیر اس کے کہ بیمار اور صحت مند خلیے ذرا بھی ایک دوسرے سے مس ہوں اور بغیر اس کے کہ بیمار خلیوں سے میکروب یا وائرس تندرست خلیوں میں سرایت کریں۔

جو ماہرین اس شہر میں تحقیق کر رہے تھے ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ کسی زندہ وجود مثلاً دل یا گردے یا بدن کے کسی پٹھے کے ہم شکل خلیوں میں سے دو گروہ منتخب کرکے انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتے تھے اور دیکھتے تھے کہ ان خلیوں سے کتنی اقسام کے فوٹون خارج ہو رہے ہیں؟ ہم بتا چکے ہیں کہ نور کے ایک ذرے کو فوٹون کہتے ہیں اور آج شعاعوں کے مشاہدے اور تحقیق میں علم کی توانائی اتنی زیادہ ہوچکی ہے کہ فوٹون پر بھی تحقیق کی جاسکتی ہے۔

ماہرین کے دوسرے گروہ نے خلیوں کو جو سالم تھے' حفاظتی ٹیوب میں رکھا۔ پھر جانداروں کا انتخاب کرکے دو علیحدہ حصّوں میں تقسیم کیا اور ان میں سے ایک حصّے کو اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے بیمار کیا کہ آیا بیماری کی حالت میں بھی خلیوں سے شعاعیں خارج ہوتی ہیں یا نہیں؟ پھر دیکھا کہ اس حالت میں بھی فوٹون خارج ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کے سالم خلیوں کو دو حفاظتی ٹیوبوں میں رکھا جن میں سے ایک سیلکان (Silicon) کا اور دوسرا شیشے کا تھا۔ سیلکان کی یہ خاصیت ہے کہ کسی قسم کا فوٹون

یعنی کسی طرح کی شعاع (سوائے ماوراء بنفشی شعاعوں کے) اس کو عبور نہیں کرتی اور معمولی شیشے کی یہ خاصیت ہے کہ سوائے ماوراء بنفشی شعاع کے ہر فوٹون یعنی ہر قسم کی شعاع اس سے گزر جاتی ہے۔

سلیکان اور شیشے کی دو ٹیوبوں میں سالم خلیوں کو چند گھنٹے بیمار خلیوں کی شعاعوں کے مقابل رکھنے کے بعد مشاہدے سے معلوم ہوا کہ سلیکان والی ٹیوب کے سالم خلیے بھی بیمار ہوگئے تھے۔ لیکن شیشے کی ٹیوب والے بیمار نہیں ہوئے۔ سلیکان چونکہ ماوراء بنفشی شعاعوں کے علاوہ اور کسی قسم کی شعاع کو گزرنے کا راستہ نہیں دیتا تھا لہٰذا ماورائے بنفشی شعاعیں تندرست خلیوں تک پہنچ کر انہیں بیمار کردیتی تھیں لیکن شیشہ ماورائے بنفشی شعاعوں کے سوا ہر قسم کی شعاعوں کو راستہ دے دیتا تھا اور چونکہ وہ شعاعیں تندرست خلیوں پر اپنا اثر نہیں ڈالتی تھیں لہٰذا وہ اپنی سلامتی کو محفوظ رکھتے تھے اور بیمار نہیں ہوتے تھے۔

یہ بھی جان لینا چاہیے کہ وہ تمام شعاعیں جو سالم خلیوں پر چمکتی تھیں' بیمار خلیوں ہی سے خارج ہوتی تھیں لیکن چونکہ یہ خلیے شیشے کی ٹیوبوں میں تھے اور بیمار خلیوں سے نکلنے والی ماورائے بنفشی شعاعوں کی زد میں نہیں آتے تھے لہٰذا محفوظ اور سالم رہتے تھے۔

یہ تجربہ طرح طرح کی بیماریوں اور متشابہ اور مختلف خلیوں کے ذریعے بیس سال میں پانچ ہزار بار دہرایا گیا کیونکہ شہر نووا سیبرسک کے تحقیقاتی مرکز کے ماہرین یہ نہیں چاہتے تھے کہ تجربے کے نتیجے میں کوئی معمولی سا شبہ بھی باقی رہ جائے۔ ان پانچ ہزار تجربات میں سب کا نتیجہ ایک ہی رہا اور وہ یہ کہ بیمار خلیے طرح طرح کی شعاعیں خارج کرتے ہیں جن میں ماورائے بنفشی شعاعیں بھی ہوتی تھیں۔

دوسرے یہ کہ جس وقت سالم خلیے بیمار خلیوں سے نکلی ہوئی ماوراء بنفشی شعاعوں کے مقابل میں (نہ کہ دوسری ماوراء بنفشی شعاعوں کے سامنے) آتے ہیں تو بیمار ہوجاتے ہیں اور تیسرے یہ کہ ان کی بیماری بھی وہی ہوتی ہے جو مریض خلیوں میں ہو۔

ان بیس سال کے طویل تجربات میں سالم اور بیمار خلیوں کے درمیان کسی قسم کا قرب اور رابطہ موجود نہیں تھا جس سے خیال پیدا ہوتا کہ ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں وائرس یا میکروب سرایت کرتے ہیں چنانچہ ہزار تجربات کے بعد ماہرین پر ثابت ہوگیا کہ سالم خلیوں میں بیماری پیدا کرنے کی ذمہ دار وہ ماورائے بنفشی شعاعیں ہیں جو بیمار خلیوں سے خارج ہو کر ان پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ اگر ان شعاعوں کی روشنی روک دی جائے تو صحت مند خلیے بیمار نہیں ہوتے۔

اینٹی بائیٹک Antibiotic (یعنی میکروب اور وائرس کی قاتل) دواؤں کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ بیمار سے نکلنے والی ان شعاعوں کو کم کردیتی ہیں' یہاں تک کہ ان کا پھیلاؤ اس حد تک گھٹ جاتا ہے کہ پھر یہ مضر نہیں ہوتیں۔ روسی دانشوروں نے جو تجربے کیے ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے بدن کا ہر خلیہ ایک بھیجنے والے اور قبول کرنے والے کی مانند ہے جو شعاعیں پھینکتا بھی ہے اور ان کا اثر قبول بھی کرتا ہے اور انہیں اپنے اندر محفوظ بھی کرتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ شعاعیں ماورائے بنفشی قسم کی ہوں جو کسی بیمار خلیے سے خارج ہوں تو انہیں جذب کرنے والا سالم خلیہ بھی بیمار ہوجائے گا۔ البتہ اگر یہ شعاعیں پھینکنے والا خلیہ مریض نہ ہو تو صحت مند خلیوں پر ان کا کوئی مضر اثر نہیں پڑتا۔

متعدد تجربات میں یہ نکتہ بھی پایہ ثبوت کو پہنچا ہے کہ اگر کچھ سالم خلیے ٹاکسین (Toxine) کے اثر سے بیمار ہوں اور ماورائے بنفشی شعاعیں خارج کرتے ہوں تو یہ شعاعیں بھی بغیر باہم مس ہوئے سالم خلیوں کو بیمار کرتی ہیں۔ ٹاکسین سے مراد وہ زہر ہے جو ہمارے جسم کے اندر موجود بعض چیزیں پیدا کرتی ہیں اور جسمانی خلیوں کو بیمار کرنے کے لحاظ سے ان کا عمل میکروبوں اور وائرس کے عمل سے مختلف ہے۔

جو چیزیں خاص طور پر آدھی عمر گزرنے کے بعد جسم کے اندر ٹاکسین کی تولید میں مدد کرتی ہیں ان میں زیادہ اور مقوی غذائیں بھی ہیں۔ بہرحال ٹاکسین جو زہر ہے سالم خلیوں کو بیمار کردیتا ہے۔ تجربہ ہوا ہے کہ جو خلیے ٹاکسین کے اثر سے بیمار ہوئے ہیں اور

شعاعیں خارج کرتے ہیں وہ بھی ماوراء بنفشی شعاعوں سے سالم خلیوں کو بیمار کرتے ہیں۔ اس کا انحصار بیماریوں میں نہیں ہے جو میکروب اور وائرس سے پیدا ہوتی ہیں۔ بلکہ ٹاکسین سے پیدا ہونے والی بیماریاں بھی مذکورہ شعاعوں کے ذریعے بیمار خلیوں سے دوسرے خلیوں میں منتقل ہو کر انہیں بیمار کرتی ہیں۔

یہ بات محتاج تفصیل نہیں ہے کہ یہ علمی حقیقت جو بیس سال میں پانچ ہزار تجربوں سے ثابت ہوئی ہے ماہرین حیاتیات اور اطباء کے سامنے بیماریوں کے علاج کے لیے ایک نیا باب کھولتی ہے اور وہ بھی دو طریقوں سے' اوّل یہ کہ بدن کے بعض خلیوں میں کسی مرض کے مثلاً سرطان کے پیدا ہونے کے بعد بیمار خلیوں سے سالم خلیوں کی طرف ماورائے بنفشی شعاعوں کی روشنی کو روکا جائے تاکہ بیماری مزید نہ پھیل سکے۔ اور دوسرا پیش بندی کا طریقہ یہ ہے کہ خلیوں کو بیمار ہی نہ ہونے دیں کہ وہ شعاعیں پھینک کر سالم خلیوں کو بھی بیمار کردیں۔

عام قاعدہ ہے کہ ہر دور میں ایک جدید طریقہ علاج دریافت ہوتا ہے جس سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ ہوجاتی ہیں اور لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اس کے ذریعے سارے امراض کا علاج ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس طبی انکشاف کے بارے میں غلو سے کام نہیں لیتے اور یہ نہیں کہتے کہ تمام امراض کا جن میں سرطان بھی شامل ہے اس طریقے سے علاج کیا جاسکتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ جن دانشوروں نے یہ انکشاف کیا ہے انہوں نے بھی علاج کا طریقہ نہیں بتایا ہے اور یہ نہیں کہا ہے کہ بیمار خلیوں سے نکلنے والی ماورائے بنفشی شعاعوں کو کس طرح روکنا چاہیے۔

پھر بھی یہ انکشاف علمی حیثیت سے قابلِ توجہ ہے اور اس پر اتنا کام اور تحقیق ہوچکی ہے کہ اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں رہا ہے۔ محققین نے دریافت کیا ہے کہ اگر کچھ خلیے کئی طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوں تو ہر بیماری سے ایک قسم کا فوٹون خارج ہوتا ہے اور اب وہ فوٹون کے لیے جنہیں بیمار خلیے طرح طرح کی بیماریوں کی وجہ سے خارج کرتے ہیں فہرست یا خود اپنی اصطلاح کے مطابق کوڈ تیار کرنے میں مشغول ہیں۔

اور چونکہ میکروب' وائرس اور ٹاکسین سے پیدا ہونے والی بیماریاں ایک دو نہیں ہیں لہٰذا اس فہرست کی تیاری میں ایک طویل مدت صرف ہوگی اور سالہا سال میں اس کی تکمیل ہوسکے گی' لیکن اس کی تکمیل سے پہلے ممکن ہے کہ بعض امراض کا علاج کیا جاسکے۔ مثلاً جب یہ معلوم ہوجائے کہ جو خلیے انفلوئنزا کے وائرس سے بیمار ہوئے ہیں وہ کونسی شعاعیں خارج کرتے ہیں اور جو ماورائے بنفشی شعاعیں ان سے خارج ہوتی ہیں' وہ کس قدر ہیں تو انفلوئنزا کے علاج اور سالم خلیوں کو بیماری سے محفوظ رکھنے کے لیے قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔

اس موضوع پر امریکہ میں بھی کچھ تحقیقات ہوئی ہیں اور اس کے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ انہیں نتائج سے ملتے جلتے ہیں جو روسی دانشوروں نے حاصل کیے ہیں اور امریکہ کے علمی رسائل میں ان کی جھلک نظر آتی ہے اور ایک محقق ڈاکٹر جوہن اوٹ نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسری صدی کے نیمہ اوّل میں امام جعفر صادقؑ کا یہ نظریہ کہ بعض انوارِ تولید مرض کا سبب ہوتے ہیں اور جسے اب تک فضول اور مہمل سمجھا جاتا تھا' مہمل اور خرافات کا جزو نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی تھا اور آج ہم جانتے ہیں کہ ماورائے بنفشی شعاع جس وقت بیمار جانداروں سے تندرست جانداروں پر اپنا اثر ڈالتی ہے تو انہیں بھی بیمار کردیتی ہے درحالیکہ سورج کی ماورائے بنفشی شعاعیں جب جانداروں کے اوپر چمکتی ہیں تو انہیں بیمار نہیں کرتیں۔

اگرچہ سورج کا نور ماورائے بنفشی ہوا کے بغیر کسی جاندار کے جسم پر پڑے اور جسم اور ان شعاعوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو تو وہ جاندار ہلاک ہوجائے گا۔ لیکن وہی شعاعیں جب ہوا کے بیچ سے گزرتی ہوئی زمین تک پہنچتی ہیں تو کسی ذی روح کو بیمار نہیں کرتیں۔

بہرحال حیات شناسی اور طب کے جدید انکشافات نے ساڑھے بارہ سو سال کے بعد امام جعفر صادقؑ کے نظریئے کی صحت ثابت کردی۔

ہم بتا چکے ہیں کہ قدیم زمانے میں انتقالِ مرض کا صرف ایک سبب سمجھا جاتا تھا اور وہ تھی بیماری کی بو۔ لیکن بہت پرانے زمانوں سے نوع بشر نے پتا لگا لیا تھا کہ بعض امراض ایک سے دوسرے انسان میں سرایت کرتے ہیں۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے ایک مصری پاپی روس (قدیم مصری اسناد کے کاغذی مکتوب) میں جواب فرانس میں ہے لکھا ہوا ہے کہ اس مقصد سے کہ مصر کے لوگوں میں بیماری سرایت نہ کرے، مسافروں کو کشتی سے ساحل پر اترنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ سند نشاندہی کرتی ہے کہ پانچ سو سال قبلِ مسیح میں کشتیاں مصر جاتی تھیں اور مسافروں کو وہاں پہنچاتی تھیں اور آج سے تین ہزار پانچ سو سال پہلے کا دریائی سفر کم از کم بحیرۂ روم یعنی آج کے بحیرۂ احمر میں ہوا کرتا تھا اور غالباً اس خیال سے کہ راستہ نہ بھول جائیں کشتیاں ساحل کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی تھیں۔

اگر زمانۂ قدیم میں انسانوں میں سرایت کرنے والے امراض کی شناخت کے بارے میں اس پاپی روس کے علاوہ اور کوئی ماخذ موجود نہیں تھا تب بھی کافی ہے اور اس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ انسان آج سے پینتیس صدی قبل بعض امراض کے ایک سے دوسرے میں سرایت کرنے سے واقف تھا۔

اب جبکہ موجودہ علوم امام جعفر صادقؑ کے مذکورہ نظریئے کو صحیح ثابت کر رہے ہیں آیا یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ ایک دوسرے کو لگنے والے امراض جو کسی علاقے میں پھوٹ پڑتے ہیں، وہ بھی نور یا روشنی ہی سے پیدا ہوتے ہیں؟ چونکہ ماوراء بنفشی شعاع بیمار خلیوں سے صادر ہونے کے بعد اپنے گرد و پیش پھیل جاتی ہے تو کیا اسی وجہ سے کبھی کبھی ایسے خطے میں جہاں کے لیے تصور بھی نہیں ہوسکتا کہ کوئی لگنے والی بیماری دفعتہً پیدا ہو کوئی شخص وبائی بیماری میں مبتلا ہوجاتا ہے؟

روسی اور امریکی محققین جنھوں نے بیمار خلیے سے سالم خلیے میں ماوراء بنفشی شعاعوں کے توسط سے بیماری کے سرایت کرنے پر تحقیق کی ہے ابھی یہ نہیں سمجھ سکے ہیں کہ اس کا اندازہ کیا ہے؟ وہ اس بات پر تو یقین رکھتے ہیں کہ یہ شعاع بیمار خلیے

سے سالم خلیے پر اثر ڈالتی ہے اور اس کو بیمار کردیتی ہے لیکن یہ نہیں جانتے کہ ایسا کس طرح کرتی ہے۔اور جب تک یہ موضوع واضح نہ ہوجائے اسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ خلافِ توقع کسی علاقے میں ایک دوسرے کو لگنے والی بیماری کا ظہور ماوراء بنفشی شعاع کے باعث ہوا ہے۔

چونکہ یہاں ماوراء بنفشی شعاع کے توسط سے سرایت کرنے والے مرض پر بحث ہو رہی ہے اور ابھی علم یہ نہیں جانتا کہ ایسا کیونکر ہوتا ہے لہٰذا ہمیں کہنا چاہیے کہ ابھی علم سالم خلیے میں وائرس کے طرزِ عمل سے ناواقف ہے۔ علم یہ تو جانتا ہے کہ وائرس خلیے میں جاگزیں ہو کر تیزی سے بڑھتا ہے اور جو دوا بیمار کو دی جاتی ہے وہ وائرس کو ختم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس پہلو سے بھی کچھ چیزیں اس سے پوشیدہ ہیں کیونکہ ابھی تک علم نے نہ خلیے کو بخوبی پہچانا ہے نہ وائرس کو اور ابھی یہ بھی نہیں جانتا کہ بدن کے خلیے کیونکر بوڑھے ہوتے ہیں؟ اگر یہ جان لیتا تو بڑھاپے کی روک تھام کرلیتا۔

روسی اور امریکی ماہرین کی تحقیقات سے اب تک جو ثابت ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ایک فوٹون بھی جو نور کا ایک ذرہ ہوتا ہے اگر ماوراء بنفشی شعاع کے ذرات میں سے شمار کیا جاسکے اور ایک بیمار خلیے سے صادر ہو تو سالم خلیے کی بیماری کا سبب ہوسکتا ہے۔

اگر ہم میکروب کو فٹ بال کے ایک گولے کے برابر تصور کریں تو اس کے مقابلے میں وائرس خلیے کے ایک چھوٹے کنکر کے برابر ہوگا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ فوٹون کتنا چھوٹا ہوگا کیونکہ یہی چھوٹا ذرہ غلّے کے اس چھوٹے کنکر کے مقابلے میں بھی اتنا چھوٹا ہوگا جتنا فٹ بال کے مقابلے میں یہ کنکر اور غالباً یہی بیماری کے ایک جرثومے کو اٹھا کر سالم خلیے تک پہنچاتا ہے ورنہ وہ بیمار نہ ہوتا۔ اور اگر فوٹون بیماری کے جرثومے کو نہیں اٹھاتا ہے تو خود ہی جرثومہ ہے۔

ہم یہ قیاس کی رو سے کہہ رہے ہیں کیونکہ ہماری عقل بتاتی ہے کہ نور کا ایک ذرہ جب تک بیماری کے جرثومے کو اٹھا کر نہ لے جائے یا خود ہی جرثومہ نہ ہو کسی سالم خلیے

میں بیماری پیدا نہیں کر سکتا۔

اس کے باوجود ہو سکتا ہے کہ فوٹون کے ذریعے تولیدِ مرض کی نوعیت پر مکمل علمی تحقیق کے بعد ہم یہ سمجھیں کہ تولیدِ مرض کا سبب بالکل کچھ اور ہے جو ہم نے فرض کر رکھا ہے۔

مختلف علوم کے اندر جن میں علمِ طبیعیات بھی شامل ہے امام جعفر صادقؑ کے مخصوص اور نادر نظریات صرف اتنے ہی نہیں ہیں جتنا اب تک بیان کیا گیا ہے بلکہ آپ اور بھی ایسے بلند نظریات کے حامل ہیں جن کی آج کے علوم تائید کر رہے ہیں۔

آپ کے خاص نظریات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خدا کے علاوہ جو چیز بھی ذاتی وجود رکھتی ہے اس کی ضد بھی موجود ہے۔ البتہ ضدین کے درمیان تصادم واقع نہیں ہوتا کیونکہ اگر تصادم ہوجائے تو بعید نہیں ہے کہ دنیا ویران ہوجائے۔

یہ نظریہ آج کے مادہ اور ضد مادہ کے نظریئے کا خلاصہ ہے جس کے بارے میں ہم گزشتہ صفحات میں مختصر بحث کر چکے ہیں اور اب یہاں بحث کی مناسبت سے امام جعفر صادقؑ کے نظریہ کے حوالہ سے ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ اب یہ مسئلہ تھیوری کی حدوں سے گزر کے عمل کے مرحلہ میں داخل ہوچکا ہے اور اب بتدریج بہت سے ممالک کے سائنس دانوں نے ضدِ مادہ عناصر کو دریافت کرلیا ہے۔

مادہ اور ضدہ مادہ عناصر کے درمیان فرق یہ ہے کہ مادہ کے ایٹم کے الیکٹرون کا برقی بار منفی ہوتا ہے اور پروٹون کا برقی بار مثبت ہوتا ہے۔ لیکن ضدِ مادہ کا ایٹم اس کے برعکس ہے۔ اس کے الیکٹرون کا برقی بار مثبت اور پروٹون کا برقی بار منفی ہوتا ہے۔

اب تک کہیں اس بات کا تجربہ نہیں ہوا ہے کہ جب مادہ کے ایٹم اور ضدِ مادہ کے ایٹم کا ٹکراؤ ہو اور دھماکہ وجود میں آئے تو کیا ہوگا۔

جو کچھ اس دھماکہ کے بارے میں کہا گیا ہے وہ تھیوری کی حد تک ہے اور اسی کی مانند ہے جیسا کہ یورینیم کے ایٹم کے بارے میں اس سے قبل کہا جاتا تھا کہ جب ابھی ۱۹۴۴ء کی گرمیوں سے قبل امریکہ نے اپنے اوّلین ایٹم بم کی آزمائش نہیں کی تھی۔

اس وقت کہا جاتا تھا کہ ممکن ہے کہ ایٹم بم کی آزمائش کے بعد کرۂ زمین پر موجود تمام عناصر بکھر جائیں اور ان کے اتصال کی زنجیر ٹوٹ جائے لیکن ایسا نہ ہوا اور گو کہ اس کے بعد بھی بارہا ایٹمی دھماکے کئے گئے اور ہائیڈروجن بم کی آزمائش کی گئی تب بھی کرۂ خاکی کے عناصر منفجر نہیں ہوئے۔

لیکن ایٹم بم کے دھماکے اور مادہ اور ضدِّ مادہ کے تصادم کے درمیان فرق ہے کیونکہ جب ایک ایٹم یا ہائیڈروجن بم پھٹتا ہے تو مادّہ کا بہت تھوڑا سا حصّہ انرجی میں تبدیل ہوتا ہے اور مادہ کا زیادہ حصہ بے کار رہ جاتا ہے یعنی انرجی میں تبدیل نہیں ہوتا۔

سب ہی جانتے ہیں کہ مادہ کے انرجی میں تبدیل ہونے کا قانون جو آئن اسٹائن نے دریافت کیا یہ ہے کہ۔

انرجی مساوی ہے حجم ضرب روشنی کی رفتار کے دگنے کے ۔

اس قانون کے مطابق وہ سب کچھ جو ایک ایٹم یا ہائیڈروجن بم کے اندر موجود ہے انرجی میں تبدیل ہوجائے تو ایک بڑی طاقت وجود میں آئے گی۔

انیسویں صدی کے انگریز ماہرِ طبیعیات ژول کے بقول اگر ایک کلو مادہ مکمل طور پر انرجی میں تبدیل ہوجائے تو دنیا نابود ہوجائے۔ لیکن بیسویں صدی میں آئن اسٹائن نے مادہ کے انرجی میں تبدیل ہونے کے قانون کی دریافت کے ذریعہ بتایا کہ ایسا نہیں اور خواہ ایک کلوگرام مادہ مکمل طور پر انرجی میں تبدیل ہوجائے تب بھی کائنات نابود نہیں ہوگی لیکن اب تک نوعِ بشر حتیٰ ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے ذریعہ بھی مادہ کو مکمل طور پر انرجی میں تبدیل نہیں کرسکی ہے۔

اگست ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم کے ایک ہزار حصوں میں محض ۱۹ حصے انرجی میں تبدیل ہوئے اور بقیہ ضائع ہوگئے۔

ہائیڈروجن بم کے مادہ کے انرجی میں تبدیل ہونے کے حساب سے ہم ناواقف ہیں اور وہ ممالک جن کے پاس یہ بم ہیں اور جنہوں نے اس کا تجربہ کیا ہے انہوں نے نہیں بتایا کہ اس کا کتنا حصہ انرجی میں تبدیل ہوا ہے کہ ہم جان سکتے کہ اس کا کتنا حصہ تلف

ہوا ہے۔ ان ممالک کی یہ خاموشی اپنے دفاعی رازوں کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت کی بناء پر ہے۔

اس کے باوجود کہ آئن اسٹائن کا قانون ظاہر کرتا ہے کہ اگر ایک یا چند کلو مادہ مکمل طور پر انرجی میں تبدیل ہوجائے تب بھی زمین نابود نہ ہوگی۔ ۱۹۴۴ء میں جب امریکی سائنس دانوں نے ایٹم بم کا تجربہ کرنا چاہا تو وہ خوفزدہ تھے کہ کہیں اس کی وجہ سے کرۂ ارض نابود نہ ہوجائے۔

آج بھی جب کہ طبیعیات میں مادہ اور ضدِ مادہ کے تصادم پر بحث ہوتی ہے تو طبیعیات کے بہی سائنس دان کہتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں یہ دونوں مکمل طور پر انرجی میں تبدیل ہوجائیں گے۔

ان سائنس دانوں کے بقول ایک کلوگرام مادہ اور اتنے ہی ضدِ مادہ کے تصادم سے اس قدر انرجی پیدا ہوگی کہ کرۂ ارضی معدوم یعنی گیس میں تبدیل ہوجائے گا اور کیونکہ ان گیسوں کی حرارت بہت زیادہ ہوگی اس لئے ہمارا شمسی نظام تہ و بالا ہوجائے گا۔

لیکن پروفیسر الفن جو اس وقت سویڈن کی لونڈ یونیورسٹی کے شعبہ طبیعیات کے استاد ہیں اس نظریہ کے مخالف ہیں اور کہتے ہیں کہ نوعِ بشر کے لئے مستقبل کی توانائی کا منبع نہ برق پیدا کرنے والے کارخانوں میں یورینیم کی افزودگی ہے نہ ہائیڈروجن بلکہ نوع بشر مستقبل میں مادہ اور ضدِ مادہ کے تصادم کے ذریعہ توانائی حاصل کرے گی اور ان عناصر کا ۱۰۰ کلو گرام یعنی ۵۰ کلو گرام ضد مادہ اور ۵۰ کلو گرام مادہ' کرہ ارض پر بسنے والے تمام نوعِ بشر کی ایک سال کی توانائی کی تمام ضروریات کے لئے کافی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اس سے قبل کہا کہ ابھی تک مادہ اور ضدِ مادہ کو ٹکراؤ کے ذریعہ پھاڑا نہیں گیا ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ اس سے کیا حاصل ہوتا ہے لیکن پروفیسر الفن' مادہ اور ضدِ مادہ کے نتیجہ میں وجود میں آنے والی طاقت کو انرجی جو مادہ سے حاصل ہونے والی معمولی قوت ہے کے مقابل ماترژی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اس دانشور کے نظریہ کے مطابق اگر آدھا کلو گرام مادہ اور آدھا کلو گرام ضدِ مادہ کا

ٹکراؤ ہوجائے تو ایک سو ملیارڈ درجہ (ایک سو ہزار ملین درجہ) حرارت وجود میں آئے گی اور یہ اس قدر حرارت ہے کہ کائنات میں اتنی حرارت پیدا کرنے والا کوئی منبع نہیں۔

ستاروں کی طبیعیات سے واقف سائنس دانوں کے نزدیک سورج کے مرکز کی حرارت دس ملین درجہ ہے۔

کیا نوعِ بشر اس قدر زیادہ حرارت کو کنٹرول کرکے اپنے استفادہ میں استعمال کرسکتی ہے؟

پروفیسر الفن کہتا ہے کہ مادہ اور ضدِ مادہ کا ناقص دھماکہ میزانِ حرارت کو بہت کم کرسکتا ہے۔ ناقص دھماکہ سے اس کی مراد ایٹم بم کے دھماکہ جیسا دھماکہ ہے کہ جس میں مادہ کی ایک معمولی سی مقدار انرجی میں تبدیل ہوتی ہے اور بقیہ ضائع ہوجاتی ہے۔

مادہ اور ضدِ مادہ کا تصادم محض تھیوری سے آگے نہ بڑھنے کی وجہ اقتصادی ہے۔ کیونکہ پروفیسر الفن کے مطابق مادہ اور ضد مادہ کے ٹکراؤ کے نتیجہ میں توانائی کے حصول کے صرف تجربہ ہی کے لئے دس سے پندرہ ملیارڈ ڈالرز کی ضرورت ہے اور آج کوئی حکومت اور کوئی ادارہ ایسا نہیں جو اس قدر رقم خرچ کرسکے۔

تجربہ سے ظاہر ہے کہ آزمائشی مرحلہ طے ہونے کے بعد مادہ اور ضد مادہ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی ماترژی کا حصول آسان ہوجائے گا۔

جیسا کہ ایٹمی طاقت سے استفادہ کے وقت تمام عناصر میں سے یورینیم کا انتخاب کیا گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ مادہ اور ضدِ مادہ کے دھماکہ سے استفادہ کے لئے ہیلیم سے استفادہ کیا جائے گا۔ کیونکہ روسی ماہرینِ طبیعیات نے ہیلیم کے ضدِ مادہ کو دریافت کرلیا ہے۔ اور ساتھ ہی روس میں مادہ اور ہیلیم کے ضدِ مادہ کے دھماکہ کے مقدمات فراہم ہیں اور ہمارے خیال میں اس کام کی اہمیت کے بارے میں بحث ضروری نہیں۔

---☆---☆---